خطبۂ صدارت

حضرت مولانا آزاد سبحانی رحمۃ اللہ

جو

اجلاس جمعیت علما

بہار میں پڑھا گیا

دار الاشاعت علوم اسلامیہ حسین آگاہی ملتان شہر

خطبۂ صدارت انجمن علماء بہار

حضرات علماءِ دین و اخوانِ ملت، السلام علیکم وعلیٰ من اتبع الہدیٰ،

جو عزت آج مجھے دی گئی ہے اسکے لئے رب العزت کے شکریہ کے بعد آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں، پھلواری کی مقدس و محترم سرزمین میں جسکی تاریخ علم و عرفان کا ایک پُرعظمت مجموعہ ہے، صوبہ بھر کے جلسۂ علماء کی صدارت ایسی عزت ہے جس پر مجھے فخر کرنا چاہئے لیکن موقع فخر کے ساتھ مقامِ تردد و خوف بھی ہے، ایسا نہو کہ میری شرمناک نا اہلیت مجھے اس منصب جلیل سے عہدہ برآ ہونے سے باز رکھے، اور جلسہ کی غرض اعلےٰ صرف میرے قصور کے باعث صحیح صحیح پوری ہونے سے رہ جائے، فخر و تردد کے اس مرکب جذبہ کے ساتھ خداوند جل شانہٗ کے بھروسہ پر اپنا اہم فرض شروع کرتا ہوں، اور آپ سے ملتجی ہوں کہ ادائے فرض میں جتنا قصور رہجائے اپنی بصیرت سے اُسے نکال کر خود غلطی سے بچ جائیگا اور مجھے معاف کر دیجئے گا،

حضرات یہ پہلے آپ سے کہہ دوں کہ میں کوئی طویل و عریض خطبہ دینے کی خواہش نہیں رکھتا یہانتک کہ آپ تھک جائیں یا مکررات کے سننے سے بد مزہ ہوں، میں تقریر کو مختصر و محدود کرنے کی کوشش کروں گا، اور یہ چاہوں گا کہ آپکے سامنے فصاحت و بلاغت کی نہریں بہانے کی بجائے اصول و تجاویز کا ایک مختصر ذخیرہ رکھا جائے جو حیاتِ عمل کے لئے کارآمد ہو اور جس سے تفریحِ نفس و تنشیطِ ذہن کی بجائے تنویرِ قلب و تاسیس کار کا کام لیا جا سکے

طبقۂ علماء و قوم

حضرات، بحث میں سب سے پہلا مسئلہ جو سامنے آنا چاہئے یہ ہے، کہ قوم اور طبقۂ علماء میں کیا رشتہ ہے، تاکہ یہ حقیقت صاف ہو سکے کہ قومی زندگی کی صف میں علماء کے لئے

کوئی ممتاز جگہ ہونی چاہیئے یا نہیں، اور اسی قضیہ کے نتیجہ کے طور پر یہ امر بھی منفصل ہو جائے
کہ نظامِ قومیت کے سلسلہ میں طبقۂ علما کے لئے کوئی مخصوص کڑی ہونا مناسب ہے
یا نامناسب ہے یعنی قومیت کی نظامِ عام میں اس طبقہ کو مخلوط کر دیا جائے یا یہ بہتر
ہو گا کہ اس کیلئے کوئی مخصوص نظام ہو جو نظامِ عام میں ایک ممتاز جز کی جگہ رکھتا ہو
اور اس حیثیت سے اس کو فائدہ پہونچاتا ہو۔

اس مسئلہ میں میری قطعی رائے پہلی شق کی تائید میں ہے یعنی قوم میں علمار کی ممتاز
جگہ ہونی چاہیئے، اور اسلئے قومیّت کے نظامِ عام میں نظام العلمار کو ایک نمایاں و مخصوص
جز کی حیثیت سے منسلک ہونا چاہیئے نہ کہ مخلوط و متلاشی حیثیت سے۔

اس رائے پر دلائل بہت ہیں، لیکن یہاں پورا دفتر کھولنا بیکار ہوگا۔ اشارتًا اس
اصول کی طرف توجہ دلائے دیتا ہوں، اسلام نے قوم میں علما کو ممتاز درجہ دیا ہے،
قرآن و حدیث اسکے شاہد ہیں، وہ آیات و احادیث جو اس اصول کے مخرج ہیں اُن میں
سے بعض عام زبانوں پر ہیں، مثلاً انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء، ھل
یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون ہ العلماء ورثۃ الانبیاء،

تاریخ بھی گواہ ہے کہ اسلام کی نظر میں علمار کا درجہ ائمہ و قائدین کا ہے، باقی تمام
قوم بلا استثنار گلہ کا حکم رکھتی ہے جس کے چرواہے علما ہیں، خلفار راشدین اسی
گروہ سے منتخب کیے گئے، عہد نبوی میں اصلی ارباب حلّ و عقد اور ارکان شوریٰ اسی طبقہ کے
افراد تھے، عہد صحابہ و تابعین میں بھی یہی سیادت و قیادت کا مالک رہا۔

خیر القرون کے بعد جب علم و حکومت علیحدہ علیحدہ ہوئے جو درحقیقت اسلام کی نگاہ
میں ایک سانحہ تھا تب حکومت کا مرتبہ تو علما کی خصوصیات سے باہر ہو گیا پھر بھی حکومت
کے علاوہ امامت و سیادت کے تمام مقامات اس مقدس طبقہ سے مخصوص تھے، اور بقیۃ الخیر
کم و بیش حیثیت میں اس آخری دور تک قائم رہا، جب تک خود مسلمانوں میں اسلام نصرانی

تعلیم وتہذیب سے مغلوب نہو سکا تھا، البتہ یہ اسلامی ضابطہ اس عہد میں پہونچکر منسوخ کردیا گیا جب مسلمانوں نے حقیقتاً یا رسمًا دونوں شکلوں میں اپنے تئیں اسلام سے نکالکر نصرانیت کے آغوش میں دیدیا، یعنی یا تو حکومت و تہذیب دونوں نصرانیوں کے حوالہ کردی، یا حکومتِ اسلامی کا ڈھانچہ توکسی طرح قائم رکھا مگر حکومت کی روح (تعلیم وتہذیب) غیروں کو سپرد کردی چنانچہ ہم بدنصیب اسی نامناسب عہد سے گذر رہے ہیں، اب امّت کی قیادت علمار کے ہاتھ میں نہیں ہے، ہندوستان ہی میں نہیں عموماً ان ملکوں میں بھی جہاں آج بھی حکومت اسلامیہ کی قرنائیں بھنکتی ہیں امّت کی قیادت عامّۃ الناس میں اس طبقہ کے ہاتھ میں ہے جو نصرانی تعلیم وتہذیب کا غلام ہے، اور پھر کمال العجب العجمی یہ کہ امّت اسلامیہ کا آقا ہے ہمارے ملک میں اس طبقہ کیلئے عوام نے مختلف اصطلاحیں وضع کی ہیں، مثلاً طبقہ جدید، طبقہ سیاسین، تعلیم یافتہ طبقہ، لیڈروں کا طبقہ. روشن خیالوں کا طبقہ، نئی روشنی کا طبقہ،

خیر، یہ اسلام پر ایک انقلاب ہے جس کے خمیازے قوم بھگت رہی ہے لیکن اصل اصول یہی ہے کہ امّت اسلامیہ کے اصلی قائدین علمار ہیں، باقی تمام امّت خواہ طبقہ جدید ہو خواہ اور طبقے مقلدین اور تابعین کا ایک گلّہ ہے اور بس، اور جبکہ نظامِ اسلامی یہ ہے تو بشرطیکہ اس نظام سے انحراف منظور نہو اور اسلام سے الگ کوئی راہ ڈھونڈھی نہ جارہی ہو یہ حقیقت بالکل مسلّم ہونی چاہئے کہ نظامِ علمار کو نظامِ قومیّت کا جیسا کہ اسلام کی بہترین عہدوں میں رہا ہے ایک خاص و نمایاں جزء ہے۔

نظامِ علمار

اس نظریہ کے مسلم ہوجانے کے بعد نظامِ علمار کا مسئلہ آتا ہے، کہ وہ کیا ہو؟ اور کس طرح ہو (۱) مسئلہ کی تشریح یہ ہے کہ علمار کی ایک علیحدہ جمعیت ہونی چاہئے جس کا نام مثلاً انجمن علمار ہو، انجمن علما اور عامۃ الناس کی انجمن میں اگر ایسی انجمن کوئی ہو تو بھی رشتہ ہونا چاہئے

جو خود علما اور عامۃ الناس میں حصولاً ہے، عامۃ الناس کی انجمن میں علما کو شرکت کا حق رہنا چاہیئے، خواہ یہ حق استعمال نہ کیا جائے، انجمن علما اور انجمن عوام میں سیاسی و غیر سیاسی کی تمیز ایک اصلی غلطی ہوگی، انجمن علما کو غیر سیاسی کی قید میں پا بہ زنجیر کردینا اس سے اقتدار کی روح کو سلب کرلینا ہے، اور بالواسطہ علما کو سیادت سے معزول کردینا، انجمن علما کو علما کی طرح جملہ مقاصد قومی پر حاوی اور تمام ذرائع قومی کا مالک ہونا چاہیئے، سیاسی ہوں خواہ غیر سیاسی، دونوں انجمنوں میں تمیز کا اصول صرف قیادت و تقلید یا کارفرمائی و نفاذ کا فرق ہونا چاہیئے۔ انجمن علما کے ذمہ قیادت و کارفرمائی ہو اور انجمن عوام، تقلید و نفاذ کیلئے وقف ہو، البتہ انجمن عوام کو مشورہ و بحث کا اختیار ہوگا، جسکے ساتھ انجمن علما کا سلوک لازمی طور پر فیاضانہ ہونا چاہیئے، مگر اسی کے ساتھ فیصلہ کا آخری اختیار انجمن علما کیلئے محفوظ ہونا چاہیئے، تاکہ قوم، بدنظمی و انتشار کے دائمی خطرہ سے گھری نہ رہے،

گویا اگر قومی حکومت ہو تو دونوں کی تمثیل حکومت و رعایا سے ہوگی، انجمن علما مجلس حکام ہوگی، اور انجمن عوام، رعایا کی مجلس۔

(۲) انجمن علما کا نظام ترکیبی یہ ہونا چاہیئے کہ انجمن کے چند ارکان ہوں اور ایک صدر، صدر امام کے لقب سے ملقب ہو، صدر کا اختیار شورے و بحث کی پابندی کے باوجود قیود، اتباع سے آزاد ہو، وہ سلطان ہے، اگرچہ جمہوریہ کا سلطان، انجمن علما عمومی و صوبہ وار دونوں طرح کی بننی چاہیئے، عمومی یا مرکزی انجمن علما کے ارکان، تعداد میں نہایت مختصر اور شخصیت میں نہایت ممتاز ہونے چاہئیں، اور اکثر وہ ہوں جو صوبہ وار انجمنہائے علما سے منتخب و نمایندہ ہوکر آئیں،

صوبہ وار انجمنہائے علما کے ارکان کی تعداد بڑی اور شخصیت عام ہونی چاہیئے،

(۳) انجمن علما کا ذاتی نظام عمل یہ ہونا چاہیئے کہ اسکے ماتحت دو اصولی شعبہ عمل قائم ہوں شعبہ عدالت، شعبہ ولایت، شعبہ عدالت کا افسر اعلی شیخ الاسلام کہلائیگا، اور شعبہ ولایت کا

رئیس اوّل والی کے نام سے نامزد ہوگا، پھر ان شعبوں کو تمام و کمال پھیلا کر تمام ضروری
عملی شاخوں کو ان کے اندر سمیٹ لیا جائے،

آخری بحث یہ رہ جاتی ہے کہ انجمن علما خود بھی کسی کے ماتحت ہوگی یا نہیں؟

بحث بہت بڑی ہے تفصیل و استیعاب کا پورا حق ادا کیا جائے تو دفتر کے دفتر
رنگے جا سکتے ہیں، مگر خلاصۂ کلام یہ ہے کہ انجمن علما ایک اطاعت سے تو کبھی آزاد نہ ہوگی کہ وہ
اللہ و رسول کی طرف سے اس پر اور ہر جماعت مسلم پر قائم کیگئی ہے، اس سے آزادی، اللہ و رسول سے
آزادی و سرکشی کے برابر ہے، یہ خلیفۂ وقت کی اطاعت ہے، دوسری اطاعتوں سے اصولاً ہر حال میں
آزادی واجب ہوگی، اور عملاً جو کچھ بمقتضائے حالت ہو، مثلاً اگر حکومت قومی ہو تو آزادی،
ورنہ پابندی مگر تا حد امکان خفیف سے خفیف درجہ تک،

تکملۂ بحث کے طور پر ایک اور مسئلہ کا انفصال مناسب ہے، وہ یہ ہو کہ ایک ملک کی انجمن
علما کو اس ملک میں محدود رکھنا ناگزیر ہے یا اس کو اصولاً سارے عالم اسلامی میں وسعت دیجا سکتی
ہے، مگر یہ حق اس ملک کی انجمن علما کا مخصوص حصّہ ہونا چاہئے، جو خلافت کا مستقر ہو، دوسرے
ملکوں کی انجمنہائے علما اپنے اپنے ملک میں محدود رہ کر ملکِ خلافت کی انجمن علما سے رشتۂ
تعلق پیدا کر سکتی ہے اور صرف اس طریقہ سے وہ بھی وسعتِ عام کے حق کو مشترک بنا سکتی
ہیں، بلکہ اس طریقہ کی وسعت طلبی تو ان کے فرائض میں داخل ہوگی۔

(۴) یہ بھی معلوم رہے کہ انجمن علما تمام قومی شعبوں پر عملاً حاوی ہوگی، اور ہر شعبہ کا آخری
سرا اس کے حاکمانہ ہاتھوں میں ہوگا۔

(۵) انجمن علما تنظیم و تعمیر قوم کا خاکہ حسب ذیل بنائیگی، نظم و نسق قومی کو اول دو شعبوں
میں منقسم کرے گی، شعبۂ تعلیمی، شعبۂ انتظامی، شعبۂ تعلیم کی دو تقسیمیں ہونگی پہلی تقسیم کی دو قسمیں
حسب ذیل ہونگی، قسم مذہبی، قسم مادی، قسم مادی تمام مادی علوم و فنون کو شامل ہوگی، جدید
ہوں خواہ قدیم، قسم مذہبی صرف علوم دینی پر محصور ہوگی۔ دوسری تقسیم کی دو قسمیں حسب ذیل

ہونگی۔ درسی و تبلیغی، شعبۂ انتظامی کو اول دو صیغوں میں بانٹا جائیگا، صیغۂ تجویز، صیغۂ عمل، صیغۂ عمل کو تین محکموں میں تقسیم کیا جائیگا، محکمۂ جمع مال، محکمۂ قیام امن و حفاظت، محکمۂ رفاہِ عام، شعبۂ تعلیم کیلئے تعلیم کی دو قسموں کے لحاظ سے دو کلیۂ تعلیمی قائم کئے جائینگے، کلیۂ دینی، کلیۂ مادی، شعبۂ انتظامی میں صیغۂ تجویز کے واسطے ایک مجلسِ تجویزی قائم کیجائیگی، صیغۂ عمل میں محکمۂ جمع مال کے واسطے ایک بیت قائم کیا جائیگا، اور قوم کے مداخل پر محصول لگائے جائینگے جسکی ایک معیّنہ صورت زکوٰۃ ہے، محکمۂ قیام امن و حفاظت کے واسطے فوج اور جندرمہ بنائی جائینگی، محکمۂ رفاہ عام کو حسبِ ضرورت مختلف حصّوں میں بانٹا جائیگا،

یہ مختصر نقشہ ہے، اس کی تفصیل کیلئے دفتر و مجلّدات چاہیئے، یہ نقشہ خاص خاص ابواب و دفعات کے سوا بہیئتِ مجموعی کوئی جدّت نہیں رکھتا، یہ زمانۂ حال کے نقشۂ حکومت ہی کا نمونہ ہے، البتہ اس نقشہ کی یہ اصولی خصوصیت ہوگی کہ اسکی اساس عام شریعت ہوگی، ہر ہر محکمہ اور محکمہ کا ہر ہر قانون و طریقِ عمل احکام شرعی کی بنیادوں پر کھڑا ہوگا، اور ہر ہر تجویز و عمل حدودِ شریعت سے گھری ہوگی، شریعت سے بے پروائی و انحراف اصولاً گوارا نہیں کیجائیگی، با ایں ہمہ یہ اندیشہ صحیح نہ ہوگا کہ ان قیود و محاصرات کی ساتھ یہ نقشۂ حکومت عہدِ حاضر کی امنگوں اور ترقیوں کا ساتھ نہ دے سکیگا، ایسا اندیشہ اسلام کی قطعی ہتک ہوگی، اور صریح کفر و زندقہ، یہ یقینی ہے کہ ان قیود و محاصرات کے ساتھ یہ نقشۂ حکومت، عہدِ حاضر کا کامیاب نظامِ عمل ہوگا، بشرطیکہ شریعت صحیح صحیح سمجھی جائے اور ٹھیک ٹھیک برتی جائے۔

نظامِ علما پر شکوک

نظامِ علما اصولاً تو شاید شکوک و شبہات کا نشانہ نہیں بن سکتا، البتہ عملی پہلو سے گنجایش ہے، ہم میں ایسے کافر تو بہت کم ہیں جو سرے سے شریعت ہی کو غلط یا منسوخ یا قابل ترمیم ٹھہرا کر اصولاً نظامِ علما کو ٹھکرا دیں، البتہ ایسوں کی کمی نہیں ہے، جو صادقانہ یا حیلہ پردازانہ کہیں کہ نظامِ علما عملاً صحیح نہیں ہے، اس سلسلہ میں جتنے شکوک یا اعتراضات قایم ہو سکتے

ہیں اُن کے اصول صرف دو ہیں (۱) موجودہ علما کی نااہلیت (۲) موجودہ تمدن کا
حد شریعت سے آگے بڑھ جانا، ان دو صورتوں کے جواب گویا اس سلسلہ کے تمام اعتراضات
کے جواب ہیں، ان میں سے دوسرے اصول کی پوری تنقید و تردید طویل بحث کو چاہتی ہے
حتیٰ کہ اسی بحث پر تصنیفات کا ایک سلسلہ تیار ہو سکتا ہے، مجملاً یہ ہے کہ موجودہ تمدن
اور شریعت میں باہمی منافاۃ کا تخیل زیادہ تر ایک غلط فہمی کا ثمرہ ہے، جو یکساں طرفین کے حق میں ہے
تمدن موجودہ کے حق میں غلط فہمی یہ ہے کہ اس کے کم بصیرت پرستار، اس کے پورے سراپا کو
عین حق تصور کرتے ہیں، اس کا پورا قالب، ان کی نظر خیرہ شدہ میں عیب سے قطعاً پاک
ہے بس ان کے فلسفہ میں ہر وہ نظام جو تمدن موجودہ سے کہیں ٹکراتا ہو، خواہ وہ ٹکر کتنی ہی
خفیف اور کم ہو، باطل ہے، اور اسکے حق میں صرف ایک فیصلہ ہے، یہ کہ مٹ جائے اور مٹا رہے
شریعت کے حق میں غلط فہمی یہ ہے کہ شریعت کو اس کے تنگ نظر شارحین، ایک قسم
کی رہبانیت ظاہر کرتے ہیں، جو تمدن کی ترقی و وسعت سے کنارہ کھڑی رہنا چاہتی ہے،
لہذا ان کی نگاہ میں تمدن کی ہر ترقی خواہ وہ کتنی ہی جائز و صحیح ہو الحاد ہے، کفر ہے، مخل نجات ہے،
اور اس کے حق میں صرف ایک ہی فتویٰ ہو سکتا ہے، یہ کہ وہ قطعاً ترک دی جائے، حالانکہ
حقیقت یہ نہیں ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ تمدن، حسن و قبح اور عیب و صواب کا مجموعہ ہے، آخر اگر
وہ قبائح و عیوب سے بالکل منزہ و مبرا ہے تو خود ائمہ تمدن آئے دن اس پر تنقیدوں کی بوچھار
کیوں کیا کرتے ہیں، پھر یہ کہ تمدن کے اصول تک میں تبدیلیوں کا یہ حیرت انگیز متواتر سلسلہ
کیوں جاری ہے، حتیٰ کہ چند صدیاں گذر جانے پر تمدن تمام و کمال بدل کر بالکل نئی صورت
اختیار کر لیتا ہے، اور جب کہ تمدن معائب و قبائح کی کمزوریوں سے پاک نہیں ہے تو کیا مضائقہ
ہے اگر شریعت کی سیادت و حکمرانی میں تمدن کو جائز قطع و برید گوارا کرنا پڑے، یہ واقعہ عالم انسانیت
کے لئے کوئی سانحہ نہ ہوگا جس کے اندیشہ سے روحوں کو گھبرا کر اٹھنا چاہئے، اور پہلے ہی
سے اس سانحہ کے سدِ باب کی کوششوں میں لگ جانا چاہئے، یہ واقعہ تو خدا کی ایک

رحمت ہو گی جو عالم انسانیت پر کبھی اُتری تھی، اور آہ کہ عرصہ دراز سے اسکا اثر ناپید ہو گیا ہے، اس دوبارہ نزولِ رحمت کی امید و انتظار میں تو ارواحِ انسانی کو چشم شوق و گوشِ قبول بنکر آمادۂ خیر مقدم ہو جانا چاہیئے، اسی طرح شریعت رہبانیت نہیں ہے، کہ وہ تمدن و عمران کی دشمنی پر تُلی ہوئی ہے، وہ تو خود قانونِ تمدن ہے، اور اتنا وسعت پسند قانون کہ مطلق العنان تمدن اس کی وسعت طلبیونکو بہم لبیک نہیں کہہ سکتا، وہ تو اتنا وسیع ہے جتنی خود کائنات، کیونکہ شریعت، خدا کا قانون کلی ہے، جو خلافتِ انسانی کی معرفت پوری کائنات پر پھیل جانا اور اس کے ذرہ ذرہ میں کار فرمایانہ کام کرنا چاہتا ہے، پس شریعت تمدن کی وسعت پذیریوں کی دشمن نہیں ہے، بلکہ عین رہنما، البتہ اس کی بے قاعدگیوں اور غلطیوں کی حامی نہیں ہے، شریعت اور تمدن کی مثال مالی اور باغ کی ہے، مالی باغ کی وسعت و شادابی کا بدخواہ نہیں ہے، البتہ اسکی خود روی کو ناپسند کرتا ہے، اسلئے وہ باغ کی دیکھ بھال کے سلسلہ میں کانٹ چھانٹ کا فرض بھی انجام دیتا پھرتا ہے تاکہ کوئی بے قاعدگی و غلطی باغ کے حسن و زینت میں خلل انداز نہ ہو، جب تمدن و شریعت کی اصل حقیقت یہ ہے تو نظامِ علما اور دیگر نظامِ شریعت کی حکمرانی سے یہ اندیشہ کیونکہ بجا ہو سکتا ہے کہ تمدن موجودہ برباد ہو جائیگا، یا یہ پیشینگوئی کیسے قطعی مانی جا سکتی ہے کہ تمدن موجودہ اس نظام کو ناکامیاب کر دیگا۔

پہلے اصول کا جواب یہی ہے اور طبقۂ علما کو ایک دعوتِ حق بھی، جواب یہ ہے کہ علما کی موجودہ نااہلیت حقیقت کے اصل پیمانہ کی رو سے کتنی ہی قابل ماتم ہو، مگر اس پیمانہ سے ہرگز زائد نہیں ہے جو کل قوم کا ہے یا یہ کہو کہ قوم کے دوسرے طبقوں کا ہے، اگر علما کی جماعت فرشتوں کی برگزیدہ جماعت نہیں ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ اُمرا کی پوری جماعت کب صحیح و آراستہ جماعت ہے اور سیاسیین یا تعلیم یافتگان جدید کی جماعت کب اولیا ر کاملین کی جماعت ہے، اور اسی طرح دوسری جماعتیں کہ علما کی نااہلیت کیلئے خاص صف ماتم

بچھائی جائے، اور قوم کا باقی حصہ، ماتم کا فرض انجام دے حقیقت یہ ہے کہ ایک خاص نقطۂ نظر سے تو قوم کی خوبی و بہتری کی زندگی کھو چکی، اور قوم کی قوم ایک ہی صف میں قابل ماتم ہے، خواہ خود قوم اپنا ماتم آپ کرے یا زمین کے دوسرے باشندے اس فرض کیلئے آمادہ ہوں، رہا افراد و خواص کی اہلیت تو الحمد للہ کہ جماعت علما اتنی سی خوش قسمتی میں دوسری جماعتوں سے پیچھے نہیں ہے، جب حال یہ ہے اور ظاہر ہے کہ قوم اپنی عام نا اہلیت کے باوجود امید و آرزو سے لبریز راہِ ترقی پر سعی کے قدم ہائے چلی جارہی ہے اور اس کے ذہن میں ترقی یافتہ مستقبل کیلئے کوئی نہ کوئی پُر امید نظام ہے پس کوئی وجہ نہیں کہ جماعتِ علما کے حق میں مایوسی کا فتویٰ مہر زدہ کر دیا جائے اور نظامِ علما کو ناقابل عمل کہہ کر ساقط الاعتبار ٹھہرایا جائے، اسکے علاوہ بحث کا اصل مدار علما کی حالت موجودہ نہیں ہے، حالت موجودہ کچھ ہو، آیندہ امکان بحث کا اصل تصفیہ کنندہ ہے، علما بحالت موجودہ نا اہل محض ہوں تو ہونے دو، دیکھنا یہ ہے کہ انمیں آیندہ اہلیت کا امکان ہے یا نہیں، اگر ہے تو یہ آیندہ امیدان کے مستقبل کے لئے ایک عمدہ نظام عمل کی معقولیت پر کافی دلیل ہے، اسی طرح جس طرح قوم کی عام نظام عمل کے لئے اسکی آیندہ امید۔ رہا اب نظام عمل کا پورا ہونا تو یہ امید کو پورے ہونے سے وابستہ امر ہوگا، علما کا مستقبل اہلیت کی معاملہ میں اگر حال سے مختلف ہوا تو نظام عمل پورا ہو سکے گا ورنہ نہیں، آخر میں مناظرانہ طرز گفتگو چھوڑ کر پوری سادگی اور سچائی سے یہ حقیقت پیش کیجاتی ہے کہ بالفعل علما کی نا اہلیت من حیث الجماعت بدیہی امر ہے لیکن اسی کے ساتھ افراداً اہلیت موجود ہونا بھی ایک آشکار واقعہ ہے جس سے آنکھ بند کر لینا تعصب ہوگا، جماعت میں احساس صحیح کا پیدا ہو جانا بھی ایک صحیح حقیقت ہے، جسکو اول نگاہ میں دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں، احساس بالفعل کتنا ہی بے ضابطہ اور غیر نتیجہ بخش ہو لیکن قطعی ہے کہ وہ ان کی استعداد اہلیت کی کافی علامت، اور اسکا

یہ نتیجہ مسلّم ہونا چاہیئے کہ جماعت علما بشرط تائید ایزدی آئندہ اپنے کو عملاً اہل ثابت کرسکتی ہے اس حالت میں ظلم ہوگا کہ جماعت علما کو محض اس کی موجودہ حیثیت کی پاداش میں اسکے مستقبل کے امکانات سے بھی محروم کردیا جائے یعنی علما کا نظام العمل جس کا منشا فوراً ہی علما کو تخت نشین کردینا نہیں ہے بلکہ اسکا منشا ان کی آئندہ بہتر نشو و نما کے ساتھ ساتھ ان کو انکا اصلی حق عطا کرنا ہے، قومی مجلس میں تسلیم نہ کیا جائے۔

اسی سلسلہ میں جماعت علما کی خدمت میں یہ گذارش کرنی ہے کہ آپکی حیثیت پر جرح و قدح آپ کے حق میں محض جام تلخ ہی نہیں ہے، غور کیجیئے تو گستاخی و سرکشی کے اس تلخابہ میں عقیدت و محبّت کی شیرینی بھی ہے، مقصد آپ کی معاندانہ توہین و تنقیص نہیں ہے مسلمان الحمد للہ اب بھی مسلمان ہیں، کافر نہیں ہوئے، مقصد صاف لہجہ میں اظہارِ حقیقت اور آپ کو بیدار کردینا ہے، جو بصیرت مندانہ محبّت و عقیدت کا واحد طریق اظہار ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس غوغارِ عام پر جو آپ کے خلاف برپا ہے، آپ کو ناراض و دل شکستہ نہ ہونا چاہیئے بلکہ برعکس آپ کو مسرور اور تازہ ہمّت ہوکر اپنے اس منصب اصلی کے لئے سچی جد و جہد شروع کردینی چاہیئے جو بحالت موجودہ آپ سے دور و دریغ رکھا گیا ہے، اور اثنائے جد و جہد میں ہر لحظہ اس بیت کو دل میں دہراتے رہنا چاہیئے کہ ؎

ہر چہ ہست از قامتِ ناسازِ بے اندامِ ماست ورنہ تشریفِ تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

حضراتِ علمائِ کرام! آپ کو اسی فخرِ جذبہ کے بقا و استمرار کے ساتھ کہ آپ منجانب پیغمبر خدا ان کے وارث اعلیٰ اور امّت کے قائدِ اوّل ہیں، اس منصفانہ احساس کو بھی کبھی قلب و دماغ سے دور نکرنا چاہیئے کہ یہ منصب جلیل کسی اہلیتِ عظمیٰ اور کسی عظیم ذمہ داری سے وابستہ ہے جو تمام غلط نفسانی جذبات کیلئے ایک زبردست تحدّی اور اعلیٰ روحانی جذبات و صفات کیلئے ایک گہری دعوت ہے جب تک اس تحدّی کے سامنے خمیدگی نہوگی اور اس دعوت کو لبیک کہا جائیگا یعنی نفسانی جذبات کی قربانی نہ دیجائیگی اور روحانی جذبات و صفات کا

استقبال نہ کیا جائیگا یہ منصب جلیل کبھی حوالہ نہیں ہو سکتا، سیپ موتی چاہتا ہی تو اسکو انتظار کی تشنگی ضرور ہے، اور تشنگی بھی صرف ایک ہی نیسان کے قطرہ کی جو موتی پیدا کرتا ہی، پروانہ اگر مذہب عشق کی امامت کا دعویدار ہے تو اسکو شمع پر جل بھنکر مرجانا پڑیگا اور اس طرح کہ اتنی عظیم قربانی بغیر کسی آہ و فریاد کے انجام پا جائے، جینے کی ہوس راحت و عیش کی غرض، تن پروری و معدہ پرستی کا اہتمام، خود کاری و خود پذیری کی فکر یہ عادتیں منصب قیادت و امامت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں، ان ضدین میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا، اور اگر اور پستیاں ہی مرغوب ہیں تو اس مقام عالی کی طلب سے ہاتھ اٹھالینا چاہیے۔

حضرات مقتدایان دین، اس مقدمہ پر نظر رکھتے ہوئے آپ بحالت موجودہ اپنے حق میں خود ہی فیصلہ دے لیجئے کہ آیا آپ بالفعل اس منصب عظیم کے مستحق ہیں یا نہیں فیصلہ ظاہر ہے کہ نہیں، کیونکہ بالفعل وہ اہلیت کبریٰ مفقود ہے، جو اس منصب کے استحقاق کی لازمی شرط ہے، فقدان اہلیت کا معاملہ اتنا دقیق نہیں ہے کہ آپ جب تک دوسرا نہ سمجھائے سمجھ نہ سکتے ہوں، نہایت واضح مسئلہ، جو قطعاً کسی دلیل کا محتاج نہیں جو واقعات کی عام سطح پر اونچے ٹیلے کی طرح دور سے نظر آتا ہے، دلیل تو نہیں تنبیہ و تذکیر کے طور پر ایک اشارہ یہ کیا جاتا ہے کہ اہلیت اور منصب دونوں لازم و ملزوم چیزیں ہیں، اہلیت ہوتی تو منصب بھی ہوتا منصب نہیں ہے پس اہلیت بھی نہیں ہے۔

حضرات خلاصۂ التماس یہ ہی کہ آپ منصب چاہتے ہوں تو اہلیت پیدا کیجئے اور نہ محض گریہ و بکا کبھی مرض کی دوا نہیں، ؎

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال   صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

اہلیت نہ ہونے کا تفصیلی علم اس طرح ہو سکتا ہے کہ یہ جاننا چاہیے کہ اہلیت کے دو رکن ہیں علم، و عمل، علمی اہلیت کا عام معیار اس زمانہ میں اتنا بلند ہے کہ عربی کا مروجہ

نصاب تعلیم اسکے لئے قطعاً ناکافی ہے، نہ کہ وہ خاص معیار جو قوم کی اعلیٰ قیادت وسیادت کیلئے مقرر ہے، اس بنا پر علماء کرام میں علمی اہلیت کی گم شدگی ظاہر ہے، عملی اہلیت کا معیار بھی روز بروز سخت ہوتا جاتا ہے، وہ معیار جو بالخصوص امامت قومی کیلئے ہے خالص قربانی ہے، آج علم کا سمندر و آفتاب اگر قربانی کی قابلیت سے خالی ہے، تمام جہلا کا امام نہیں بن سکتا نہ کہ خواص قوم کا یا پوری قوم کا، جماعت علما اس قابلیت سے کوسوں دور ہے۔ خلاصہ یہ کہ جماعتِ علما کے پاس بد قسمتی سے نہ موجودہ زمانہ کا دماغ ہے، نہ موجودہ زمانہ کا دل، لیکن اسی کے ساتھ اسکو نہ بھولنا چاہیئے کہ یہ بد نما نقشہ علما کی جماعت کا ہے نہ کہ کل افراد کا، خشک و منجمد، بادلوں میں تر اور برسنے والے لکہ ہائے ابر بھی ہیں، اس فیصلہ کے وقت اس نکتہ کو بھی دُور از نظر نہ ہونا چاہیئے کہ ایک فریق کے حق میں یہ حوصلہ شکن حکم، بالکل حقیقت نفس الامر کی رو سے ہے، نہ کہ موازنہ وتناسب کی جہت سے، یہ حیثیت جب ملحوظ نظر ہوگی تو فیصلہ کی صورت وہ جو بہت پہلے مقام سوال وجواب میں بیان کردی گئی ہے یعنی یہ کہ علما کی حالت قوم کی دوسرے طبقوں کے مقابلہ میں قابل ندامت نہیں ہے ؏

من واو ہر دو خواجہ تاشائیم

نظامِ علما کا آغاز *

علما و قوم دونوں کے لئے یہ مسرّت خیز واقعہ ہے کہ الحمد للہ نظام علما ابتک محض ایک مرتبہ تجویز ہی میں نہیں ہے، عمل کی جانب بھی اسکے قدم اُٹھ چکے ہیں، صوبہ وار انجمنہائے علما قائم ہونا شروع ہوگئی ہیں، انجمن علمائے بنگال تو مدّت سے قائم ہے، کچھ عرصہ ہوا ذیل کے صوبوں نے بھی انجمن علما قائم کرلی ہے، صوبہ متحدہ، صوبۂ دہلی، راجپوتانہ، مدراس سندھ عارضی طور پر بمبئی بھی، عارضی طور پر ملک کی مرکزی انجمن علما بھی وجود میں آچکی ہے بقیہ صوبوں میں کوشش جاری ہیں، عارضی انجمن علماء ہند کو جلد سے جلد مستقل بنایا

جانا زیر تجویز ہے، یہ بھی قابل لحاظ امر ہے کہ ان انجمنوں کی ہستی دستور العمل کے صرف کاغذ ہی پر نہیں ہے، ہنگامۂ عمل میں بھی اسکے آثار و علائم ظاہر ہو چکے ہیں، انجمن علمار بنگال دعوۃ اسلامی کے کاموں میں خاص شہرت پا چکی ہے، انجمن علمارِ بہار کا موجودہ اجلاس اس کا تیسرا سالانہ اجلاس ہے، انجمن علمارِ متحدہ کا پہلا جلسہ مسئلہ خلافت کے متعلق ابھی حال میں اتنا پر زور ہو چکا ہے کہ عرصہ تک اسکی گونج فضارِ ہند میں باقی رہے گی، سندھ کی انجمن علما بھی اسی مسئلہ میں سرگرمی عمل دکھا چکی ہے، انجمن علمار ہند با وجود غیر مستقل ہونے کے امرت سر میں اپنا پہلا جلسہ کر چکی ہے، اس سلسلہ میں یہ بات مزید مسرت کی ہے کہ ان انجمنوں کا اعتراف و احترام جمہور قوم کی طرف سے شروع ہو گیا ہے اور اس بات پر قرائن و آثار ہیں کہ یہ انجمنیں جس قدر قوت و وسعت کی طرف بڑھتی جائیں گی، جمہور کا اعتراف و احترام ترقی کرتا جائیگا، انجمن علمارِ بنگال کے چاٹگامی جلسہ میں میں نے بچشم خود بنگال کے اسلامی جمہور کا جوش عقیدت و خدمت انجمن علمارِ بنگال کے لیئے نظارہ کیا ہے، انجمن علمار متحدہ کے ساتھ جمہور نے جس اطاعت و انقیاد کا ثبوت دیا ہے اس کے تماشا کرنے والے آج اس جلسہ میں بھی موجود ہیں، اخبارات برابر ان انجمنوں کے ہم آہنگ رہے ہیں، اور انھوں نے لیگ و کانگریس کی صف کارفرمائی میں ان کو بھی برابر کی جگہ دی ہے، اسی مقدس سلسلہ کی ایک قیمتی کڑی انجمن علمار بہار کی داستان اہل بہار کیلیئے زیادہ دلچسپ ہونی چاہیئے، اسلیئے اس موضوع پر کسی قدر تفصیل خرچ کیجائے تو مناسب ہوگا۔

انجمن علمارِ بہار

انجمن علمارِ بہار کی پوری رُوداد تو اسکے محترم ناظم مولانا محمد سجاد صاحب مہتمم مدرسہ انوار العلوم گیا سُنائینگے میں صرف چند اصولی باتیں کہے دیتا ہوں، انجمن علمار بہار کی بابرکت بنیاد مدرسہ انوار العلوم کے سالانہ جلسہ کے موقع پر ایک نہایت مختصر جماعت کے ہاتھوں رکھی گئی، یہ وہ موقع تھا جبکہ ایک بنگال چھوڑ کر پوری فضارِ ہند تنظیم علمار کی تحریک سے

غیر متاثر خاموش پڑی ہوئی تھی، یہ ضرور ہے کہ بنگال، بہار سے پہلے بیدار ہو چکا تھا،
اور انجمن علمار بہار کے وجود سے کئی سال پہلے انجمن علمار بنگال قائم ہو چکی تھی، مگر اول تو
انجمن علمار بنگال صرف دعوتی انجمن تھی سیاست قطعاً اس کے پیش نظر نہ تھی، بس وہ پورے
معنی میں انجمن علمار نہ تھی، درحالیکہ انجمن علمار بہار اور دوسری انجمنہائے علمار جامع
انجمنیں ہیں، اور سیاست ان کا اولین موضوع عمل ہے، اس لحاظ سے انجمن علمار بہار کیلئے
یہ دعویٰ غلط نہیں ہے کہ وہ ہندوستان کی پہلی انجمن علما ہے، اسکے علاوہ انجمن علمار بنگال
خود پیدا ہو کر رہ گئی دوسرے صوبوں میں اپنی نسل بڑھانے میں کامیاب نہ ہوئی، تقریباً ۸ سال
کی مدت گذر گئی مگر دوسرے صوبوں نے اس امر میں بنگال کی تقلید نہ کی، انجمن علمار بہار کو یہ
عزت حاصل ہے کہ اس نے پیدا ہوتے ہی دوسرے صوبوں کو اس تحریک سے متاثر کر دیا، اور
اس کی نسل اکثر صوبوں میں پھیل گئی، انجمن علمار بہار کے قائم ہوتے ہی متحدہ صوبہ دہلی،
راجپوتانہ، سندھ وغیرہ میں انجمنہائے علمار کا تار بندھ گیا، پھر اس سلسلہ کی تکمیل کیلئے انجمن
علمار ہند بھی وجود میں آگئی، اس لحاظ سے بھی انجمن علمار بہار ہندوستان کی پہلی انجمن
علمار کہی جاسکتی ہے، یعنی پہلی متعدی الفیض انجمن علمار، ان خصوصیات کو قطع نظر کر لیجئے
تو کم سے کم وہ دوسری انجمن منما ہے، مگر پہلی انجمن علما کی نسبت زیادہ جامع و صحیح۔
یاد رکھئے کہ یہ منقبت خوانی کسی کی تنقیص اور کسی کی بیجا مدح سرائی کی نیت سے نہیں ہے
انجمنہائے علمار کی صحیح تنقید اور صحیح تاریخ کا سامان فراہم کرنا ہے، ورنہ بنگال و بہار دونوں میرے
لئے یکساں ہیں، بلکہ بنگال و انجمن علمار بنگال سے تو بہار و انجمن علمار بہار سے پہلے کے تعلقات ہیں
انجمن علمار بہار اپنے صوبہ میں بفضلہ نہایت ہر دلعزیز اور پُر شوکت مجلس ہے، پھلواری شریف
جیسے مرکز علم و عمل کی اہمیت مشتاقانہ شرکت، اسکی مقبولیت و شوکت کی کافی شہادت ہے۔
انجمن علمار بہار کا یہ تیسرا جلسہ ہے، اس سے پہلے کے دونوں جلسے کامیاب تھے، یہ جلسہ
بھی بفضلہ ازیدی کامیاب اور پہلے سے زیادہ پُر شان ہے۔

اس جلسہ کو چند ایسی پُر فخر خصوصیتیں حاصل ہیں، جو بمشکل دستیاب ہوتی ہیں،
(۱) پھلواری جیسی زندہ جلوہ گاہِ علم و فقر کا مقامِ جلسہ ہونا، (۲) حضرت مولانا سید
شاہ سلیمان صاحب پھلواروی مدظلہ جیسی اعلیٰ و محیط شخصیت کا داعی جلسہ ہونا، (۳)
حضرت مولانا شاہ محی الدین صاحب خلفِ اکبر و ولیعہد حضرت قبلہ مولانا شاہ بدرالدین صاحب
سجادہ نشین خانقاہ کا صدرِ استقبالی ہونا، انجمن علماءِ بہار کا دستورِ اساسی بتاتا ہے کہ اس کے
مقصد کے دو شعبے ہیں، شعبۂ سیاست، شعبۂ تعلیم، شعبۂ تعلیم میں شعبۂ دعوت بھی ہے،
شعبۂ دعوت کے متعلق کام شروع ہو چکا ہے، گیا مرکزِ انجمن میں، اس مقصد کیلئے جمعیۃ الدعوۃ
بہار مولانا سجاد کی سرپرستی میں قائم کردی گئی ہے، جو اپنی ماتحت ضلع گیا کی جمعیۃ الدعوۃ
کے واسطہ سے ایک ضلع میں دعوت کا عملی کام شروع کر رہی ہے، اور آئندہ رفتہ رفتہ
اپنا حلقۂ عمل پورے صوبہ میں انشاء اللہ پھیلا دے گی۔

شعبۂ سیاست میں بھی استطاعت کے موافق برابر کام ہوتا رہا ہے، عین وقت پر اس نے
ایک جلسۂ خصوصی کے ذریعہ مسئلہ خلافت پر پُر زور احتجاج بلند کیا، اور زبردست تجویزیں
منظور کیں، اس مفید حرکتِ عمل سے جمہور بہار کی آواز کو جو قوت حاصل ہوئی ہوگی وہ ظاہر
ہے، یہ جلسہ بھی خالص مسئلہ خلافت کیلئے منعقد ہوا ہے، پیشِ نظر دوسرے سیاسیات
بھی ہیں گو مسئلہ خلافت کے سامنے قصداً انھیں تحتِ التوا کردیا گیا ہے، مسئلہ خلافت کے
کامیاب خاتمہ کے بعد وہ بھی سامنے آئیں گے، اور انجمن انشاء اللہ مستقل طور سے ان پر
قوت صرف کریگی، یہاں ایک ضروری بحث شعبۂ سیاست میں مقصد کے تعین کی ہے، انجمن کے
دستورِ اساسی سے مترشح ہے کہ انجمن کا مقصدِ سیاسی، مسلم تعلق کے رو سے ہندوستان کو حقیقی
"دارالاسلام" بنانا ہے، علما کی انجمن مذہبی کا سیاسی مقصد ایسا ہی مسئلہ ہو سکتا ہے جیسا کہ
یہ ہے، اس مقصد سے کوئی حیرت و پریشانی نہ ہونا چاہیے، یہ ایک کلمۂ حقیقت ہے،
کہ اس مسئلہ کی صحیح شرح ہندوستان کے متفقہ سیاسی منصوبہ حکومتِ وطنی (ہوم رول) کے

منافی نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے کا معین ہے، اور ترقی کرکے یہ کہا جاتا ہے کہ عملی حیثیت سے ایک دوسرے کا موقوف علیہ ہے اجمال ہے جسکی تفصیل وقت ضرورت سے متعلق ہے میں یقین کرتا ہوں کہ تمام انجمنہائے علما حتیٰ کہ انجمن علمار ہند کا مقصد سیاسی بھی یہی مسئلہ قرار پائیگا، کیونکہ اس قسم کی انجمنوں کیلئے سیاسیات میں اس ایک راہ کے سوا کوئی دوسری موزوں و مطابق راہ ہو ہی نہیں سکتی اور اس سے انحراف کا معنی اپنی نوعیت سے انحراف کرنا ہوگا اور دوسری نوعیتوں میں فنا ہو جانا ہے پس جو کچھ انجمن علمار بہار کے دستور العمل سے مترشح ہے علی صواب ہے، اور یہ توسّس انجمن اس صحیح اجتہاد پر اجر و مبارکباد کی مستحق ہیں امید ہے کہ دوسری وہ انجمنہائے علمار جو ابتک اپنا دستور العمل نہیں بنا چکی ہیں اس صحیح اجتہاد کی تقلید کریں گی۔

مسئلہ خلافت

ابھی تک میرا بیان، مقصد وقت کے لحاظ سے تمہید سے آگے نہیں بڑھا، وقت کا اصلی مقصد تو اب صرف ایک ہی چیز ہے مسئلہ خلافت، اس جلسہ کا بھی اصلی موضوع مسئلہ خلافت ہے مسئلہ خلافت پر میں بہت مختصر تقریر کرونگا، اس لئے کہ یہ مسئلہ عرصہ سے ہندوستان کا وظیفہ عام بنگیا ہے اور اسپر اس قدر کہا اور لکھا جا چکا ہے کہ اب طول نگاری اور طول گوئی کی بہت کم ضرورت ہے میں بیان میں نہایت اختصار کی کوشش کرونگا اور زیادہ تر مسئلہ کے صرف دو پہلو پر بحث کرونگا، خلافت کی حقیقت، خلافت کے متعلق مسلمانوں کے فرائض، خلافت کی حقیقت شرعی کا نہایت واضح ماخذ شرعی ذیل کی آیت ہے یا ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم امرت سے ایماندار وں کے لئے تین اطاعتوں کی فرضیت ثابت ہوتی ہے، اللہ کی اطاعت، رسول کی اطاعت، اور اولوالامر کی اطاعت،۔

اللہ و رسول تو ظاہر ہے کہ کون ہیں تفسیر کی ضرورت نہیں، اولوالامر سے سلاطین مراد

ہیں جیساکہ مفسرین کی رائے ہے، دلیل یہ ہے کہ امر عربی زبان میں حکم کیلئے وضع ہی
پس اولوالامر کا صحیح مفہوم ارباب حکم ہے، اب عرب عام سے مدد لیکر اسکا پتہ چلا لینا آسان
ہے کہ ارباب حکم حقیقی معنی میں انسانوں کا کونسا گروہ ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ صرف بادشاہوں
کا گروہ بعض دوسرے گروہ اگر ارباب حکم کہلاتے بھی ہیں تو محض مجازاً و توسعاً، کیونکہ وہ
فی الحقیقت حکم والے نہیں ہوتے، بلکہ وہ حکم بتانے والے یا حکم چلانے والے ہوتے ہیں، بادشاہوں کے
علاوہ بظاہر صرف دو گروہ ایسے ہیں جن پر ارباب حکم کا اطلاق ہوتا ہے، حکام و علما، دونوں
کی نسبت دعویٰ صحیح ہے، حکام حکم والے نہیں ہیں، حکم تو بادشاہ کے ہوتے ہیں، یہ صرف
اس کو چلاتے ہیں، اگر یہ کہئے کہ چھوٹے چھوٹے احکام خود ان کے اپنے بھی ہوتے ہیں تو
یہ مسلم لیکن ایسے چھوٹے چھوٹے حکم تو ہر شخص کو اپنے ادنیٰ ماتحت کے مقابلہ میں حاصل
ہوتے ہیں حتی کہ صفائی کے جمعدار کو اپنے بھنگیوں پر اور مہاجن کو اپنے قرضداروں پر،
تو اس قسم کے جزئی احکام کا مالک ہونا اگر "ارباب حکم" کی کلی اصطلاح کیلئے کافی ہو تو
پھر کو ارباب حکم اور اولوالامر بلکہ ہر شخص کو صاحب حکم اور ذوالامر ماننا چاہئے
اور اس کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت کے ساتھ ساتھ منصوص و مؤکد تسلیم
کرنا چاہئے، اور یہ صریح مضحکہ کی بات ہے، پھر یہ کہ اس عموم کے بعد اصطلاح کی خصوصیت
کیا باقی رہ جاتی ہے، اولوالامر اس تقدیر پر مرادف ہوگا الناس کا، پھر اس حکم کا کیا معنی
رہ جاتا ہے جو آیۂ مذکور میں دیا گیا ہے کہ اے ایمان والو اولوالامر کی اطاعت کرو،
کہ اے ایمان والو تم میں سے ہر شخص ہر شخص کی اطاعت کرے، پس ظاہر ہے کہ "ارباب
حکم" اولوالامر میں صرف وہ بڑے بڑے حکم معتبر ہوں گے جو اللہ و رسول کے احکام کے
پہلو بہ پہلو مذکور ہو سکیں اور یہ ہی حکم ہیں جو بادشاہوں کو حاصل ہوتے ہیں، اسی طرح
علما حکم والے نہیں ہوتے حکم تو اللہ و رسول کے ہوتے ہیں، وہ صرف ان کے بتانے والے ہیں،
پس حقیقی معنی میں صرف بادشاہ ہی، ارباب حکم و اولوالامر ہیں، بشرطیکہ حقیقت کو

اتنی گہرائی میں نہ لیجایئے جہاں اللہ کے ایک وجود کے سوا ہر شے مجازی بنجاتی ہے، علاوہ بریں اگر توسع و مجاز کو نظر انداز نہ کیجئے پھر بھی حقیقت کو مجاز پر ترجیح رہے گی، اور کم سے کم اتنا تو ضروری ہوگا کہ اگر کوئی قرینۂ انصراف موجود نہیں ہے تو بدرجۂ مساوی مجاز کے ساتھ حقیقت بھی باقی رہے، پس اگر اولوالامر میں کل مجازی ارباب حکم خاص سمجھے جائیں تو کم سے کم سلاطین بھی تو داخل رہیں گے، جو حقیقتاً ارباب حکم ہیں کیونکہ ان کو مصداق لفظ سے خارج کردینے پر کوئی قرینۂ انصراف نہیں ہے، اس تقریر پر بھی اولوالامر سے سلاطین مراد ہونگے، غایت ما فی الباب یہ ہے کہ کچھ اور طبقے بھی شامل مراد ہوں، پس اطاعتِ سلاطین کا وجوب بہر حال ثابت ہے، پھر یہ کہ اطاعت کا پیمانہ بھی مطاع کے پیمانہ کے مطابق ہونا چاہیے اللہ سب سے بڑا ہے اور سب سے مقدم ہے تو اس کی اطاعت بھی سب سے بڑی اور سب سے مقدم ہوگی، اسکے بعد رسول کی اطاعت اسی اصول پر، اولوالامر میں بشرطیکہ اس میں مدارج ہوں جو سب سے بڑا طبقہ اولوالامر ہے اس کی اطاعت سب سے بڑی اور مقدم ہوگی، اور یہ ظاہر ہے کہ اولوالامر میں سب سے بڑا طبقہ بادشاہوں کا ہے پس ان کی اطاعت تمام اولوالامر طبقوں سے بڑی اور مقدم ہوگی، باقی سب طبقوں کی اطاعت چھوٹی اور ماتحت، پس یوں بھی یہ ثابت ہے کہ اطیعوا اولوالامر سے اولاً سلاطین کی اطاعت مراد لینا اور حکم وجوب میں اس کو زیادہ پیش نظر رکھنا نفس الامر کی پوری مطابقت ہے، خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اولوالامر سے سلاطین مراد ہیں خواہ فقط خواہ دوسرے مصادیق کے ساتھ، پس تیسری فرض اطاعت اطاعت سلاطین کی اطاعت ٹھہری، اس کے بعد لفظ مِنْکُمْ آیا ہے جو اولوالامر کی قید ہے اس قید سے ملا کر اولوالامر کی تفسیر کیجئے تو مسلم سلاطین مفہوم نکلتا ہے، اس تقدیر پر اطاعتِ ثالثہ کی فرضیت بجائے عام سلاطین کے مسلم سلاطین میں منحصر ہو جاتی ہے خلاصۂ حکم یہ ٹھہرتا ہے، کہ مسلمانوں کو اللہ و رسول کی دو اطاعتوں کے بعد ایک اور اطاعت

فرض ہے، وہ مسلم سلاطین کی اطاعت ہے۔

اولوالامر کی تفسیر کا مرحلہ طے ہوگیا، اب یہ جاننا چاہئے کہ زبانِ شریعت میں مسلم سلطان کا ایک اور نام لیا گیا ہے، بلکہ وہی اصل نام ہے، خلیفہ، اس دعوے پر کہ خلیفہ مسلم سلطان ہی کا دوسرا نام ہے، خلفاء اربعہ کی حیثیت و لقب سے شہادت لاتا ہوں ظاہر ہے کہ خلفاءِ اربعہ مسلم سلاطین تھے اور یہ بھی یقینی ہے کہ ان کا لقب خلیفہ تھا، پس مسلم سلطان اور خلیفہ دونوں ایک ہی خبر ہیں پس مسلم سلطان کی اطاعت کا حکم بجنسہ خلیفہ کی اطاعت کا حکم ہے، نتیجہ یہ کہ زیرِ بحث آیہ سے اطاعتِ خلیفہ کا وجوب ثابت ہے، اور یہیں سے خلافت کی ضرورت اور خلافت کی، ماہیت بھی متحقق ہے۔

خلافت کی ماہیت جو یہاں سے متحقق ہوتی ہے حکومت اسلامی ہی، یعنی حکومتِ اسلامی ہی کا دوسرا نام خلافت ہے، خلافت کی ضرورت اس طرح ثابت ہوئی کہ اطاعت کی فرضیت مطاع کی ضرورت کو مستلزم ہے، مطاع ہی نہیں تو اطاعت کا محل کون ہوگا، اور فرض اطاعت کس طرح ادا ہوگا، اور اطاعتِ خلیفہ کو فرض گردانا گیا ہی، پس خلیفہ اور ضمناً خلافت کا وجود ضروری ٹھہراتا کہ اطاعتِ خلیفہ کا فرض پورا ہو سکے، اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اطاعتِ خلیفہ کی فرضیت ایک مشروط حقیقت کیوں نہ مانی جائے، یعنی یہ کہ جب خلیفہ ہو تو اسکی اطاعت فرض ہے، ورنہ نہیں، اور اس صورت میں خلیفہ و خلافت کا ہر زمانہ میں وجود لازمی نہیں رہ جاتا، اس کی نظیر اطاعتِ رسول کا مسئلہ ہے، کہ وہ ایک مشروط حقیقت ہے، جسکی تفسیر یہ ہے کہ جب رسول ہو تو اسکی اطاعت فرض ہے، مشروط حقیقت ہونے کا یہ اثر ہے کہ رسالت ہر زمانہ میں لازمی نہیں رہتی تاکہ یہ ہو کہ ہر زمانہ میں مسلمان امام و سلطان کی طرح ایک رسول بھی گھڑ کر قایم کر لیا کریں، جواب یہ ہی کہ اطاعتِ رسول تو بے شک ایک مشروط حقیقت ہی، مگر ذاتِ رسول کے لحاظ سے نہ احکامِ رسول کے لحاظ سے کہ احکامِ رسول کے لحاظ سے تو اطاعتِ رسول مستمر حقیقت ہی، یعنی رسولِ اسلام کی اطاعت

کیونکہ صرف انھیں کے احکام مستمر الی یوم القیامۃ ہیں، بقیہ تمام رسولوں کے احکام انکی ذاتوں کی طرح محدود الوقت و منقطع ہیں، پس دوسرے رسولوں کی اطاعت من حیث الاحکام بھی حقیقت مشروط ہے، جیسے من حیث الذات، اس کے برعکس رسولِ اسلام کی اطاعت صرف من حیث الذات حقیقت مشروط ہے نہ من حیث الاحکام مگر اس پر اطاعتِ خلیفہ کے قیاس کا کوئی امر داعی نہیں ہے۔ اطاعتِ رسول (من الذات کو) تو اسلیے حقیقت مشروط ماننا پڑتا ہے کہ اسلامی رسالت آں حضور صلعم کی ذات پر ختم ہو جاتی ہے، آئندہ کوئی رسول مبعوث نہ ہوگا، نہ رسول جو انسانوں کی طرف سے مقرر ہونے کی چیز ہے کہ لوگ اپنی طرف سے رسول مقرر کرسکیں گے لیکن یہ مجبوری اطاعتِ خلیفہ کے مسئلہ کو لاحق نہیں ہے کہ نہ خلافت ختم ہوئی ہے نہ وہ رسالت کی طرح آسمانی منصب ہے جس کو زمین والے قائم نہیں کرسکتے وہ من حیث الذوات مستمر الی یوم القیامۃ ہوسکتی ہے یعنی ہر زمانہ ایک نیا خلیفہ مقرر کرسکتا ہے اور یہ اختیار تاقیامت باقی رہیگا، پس کوئی امر داعی نہیں ہے کہ اطاعتِ خلیفہ، اطاعتِ رسول پر قیاس کر کے حقیقتِ مشروط قرار دی جائے، قیاس کو جانے دو کہ وہ بلا وجہ ہے اور اگر صرف امکان پر اعتماد کیا ہے یعنی یہ کہ جب اطاعتِ خلیفہ کا حقیقت مشروط ہونا ممکن ہے تو کیوں نہ یہی مراد لیجائے تو گفتگو صورتِ ترجیح میں ہوگی یعنی کہ ممکن دونوں شقیں ہیں حقیقتِ مشروط بھی اور حقیقت مستمرہ بھی، لیکن ترجیح کسکو ہے، ترجیح حقیقت مستمرہ کی شق کو ہے، کیونکہ آیت کی عبارت کسی شرط کے اشارہ سے خالی ہے، اسی کے ساتھ عقل، خلافت کے استمرار کو زیادہ معقول سمجھتی ہے کیونکہ عدم استمرار کی صورت میں اللہ و رسول کی دو اہم اطاعتوں کے بعد جو من حیث الاحکام مستمر چیزیں ہیں اطاعت خلیفہ کا غیر مستقل ضمیمہ فضول ٹھہرتا ہے کیونکہ اس کی کوئی بنیاد نہیں رہتی، اس لئے کہ جو بنیاد تجویز کی جائیگی وہ خلافت کے استمرار کو چاہے گی، مثلاً یہ بنیاد قرار دی جائے کہ ہر زمانہ میں اللہ و رسول کے احکام کا بقوۃ اجرا

کرایا جائے، تو یہ خلافت کے استمرار کو چاہتی ہے، کیونکہ ہر زمانہ احکام اللہ و رسول کے بقوۃ اجرا کا یکساں محتاج ہے، اسی طرح ہر بنیاد یہ قباحت اطاعت خلیفہ کو حقیقت مشروطہ ماننے کی صورت میں لازم آتی ہے، مگر حقیقت مستمرہ کی صورت میں نہیں لازم آتی کیونکہ اس صورت میں مثلاً وہ بنیاد جو اوپر بیان کیگئی ہے محض اس بنا پر کہ وہ خلافت کے استمرار کو چاہتی ہے مسترد نہیں ہو سکتی کیونکہ استمرار خلافت تو اس صورت کا عین نتیجہ ہے، درحالیکہ محض اسی بنا پر حقیقت مشروطہ کی صورت میں مسترد کردی گئی ہے، یہاں سے حقیقت مشروطہ کی شق پر حقیقت مستمرہ کی ترجیح جس کا دعوٰی کیا گیا تھا ثابت ہے، اور جس کے نتیجہ میں اصل دعوٰی بھی ثابت ہے جو یہ تھا کہ اطاعتِ خلیفہ، خلیفہ اور خلافت کی مستقل ضرورت کو مستلزم ہے، جب یہ بھی ثابت ہو تو خلاصہ باب یہ ہوا کہ آیہ مذکور ہی خلافت اور خلافت کی اطاعت کی بدرجہ فرض ضرورت قطعاً ثابت ہے۔

یہانتک مسئلہ خلافت پر ایک خاص طرز میں گفتگو تھی جس کا غالب منشا مسئلہ کا استنباط اور اس پر استدلال دکھانا تھا۔ اب یہاں سے مباحثانہ و مدافعانہ حصۂ گفتگو شروع ہوتا ہے جس میں زیادہ تر اعتراضات یا سوالات کے جواب دے جائیں گے، اس مسئلہ پر جتنے اہم اور اصولی سوال یا اعتراض ہو سکتے ہیں انکی مکمل فہرست حسب ذیل ہے سوالوں کے لبعد بدفعات جواب آئیں گے۔

(۱) اگر خلافت کی حقیقت علی الاطلاق صرف اسلامی حکومت ہے بغیر کسی زائد قید کے جیساکہ دعوٰی کیا گیا ہے تو پھر ایک زمانہ میں کئی کئی خلافتیں ہو سکتی ہیں، کیونکہ ایک زمانہ میں کئی کئی اسلامی حکومتیں ہو سکتی ہیں، حالانکہ خلافت ہر زمانہ میں بزعم مدعیان ایک ہی ہونی چاہیے۔

(۲) اگر خلافت علی الاطلاق اسلامی حکومت سے عبارت ہے اور ایک مستمر چیز ہے جیسا کہ اس تفسیر کا مقتضا ہی تو پھر وہ حدیث کیا ہوگی جس کا یہ منشا ہی کہ خلافت عہد نبوی کے

بعد صرف تیس برس رہی اس کے بعد خلافت کی جابر و جائر حکومتوں نے لے لی۔

(۳) اگر خلافت مطلقاً اسلامی سلطنت کا نام ہے اور خلیفہ مطلقاً مسلم سلطان کا نام تو پھر خلیفہ کے لئے قرشیت کی شرط کی جو احادیث میں آئی ہے کیا تاویل ہوگی۔

(۴) اگر خلافت حکومت سے عبارت ہی جس کا منشا یہ ہے کہ حکومت کے بغیر خلافت متحقق نہیں ہو سکتی تو پھر آخری دورِ خلافت، عباسیہ میں جبکہ خلفاء کا کام صرف خطاب بخشی رہ گیا تھا اور سلطنت رخصت ہو چکی تھی خلافت کیوں تسلیم کیجاتی تھی، کیا یہ واقعہ اس امر کا ثبوت نہیں ہی کہ خلافت اصل میں ایک روحانی منصب ہے جسکے لئے حکومت شرط نہیں ہے، البتہ حکومت اسکے ساتھ کبھی اتفاقاً جمع ہو جاتی ہے۔

(۵) انعقاد خلافت یا تقرر خلیفہ کا اصولی طریقہ کیا ہی جمہوری انتخاب یا وصیت،

(۶) خلافت و امامت دونوں ایک ہی منصب ہیں یا الگ الگ،

(۷) خلافت کی بنا ر قیام کیا ہے، کیا اللہ و رسول کی اطاعت، عمل بالشریعت کو کافی نہیں ہیں۔

(۸) خلافت کے فرائض و شرائط کیا ہیں اور وہ سب کے سب موجودہ نام نہاد خلافت میں پائے جاتے ہیں یا نہیں۔

جوابات بدفعات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) خلافت، حکومت اسلامی ہی سے عبارت ہے، مگر اتنی سی قید کے ساتھ کہ اپنے زمانہ کی سب سے بڑی حکومت ہو، پس ایک زمانہ میں کئی کئی خلافت لازم نہیں آئی کہ سب سے بڑی اسلامی حکومت تو ایک زمانہ میں ایک ہی ہوگی، یہ قید کہاں سے مستنبط ہوئی، اس سوال کا جواب ہی کہ اسی آیت سے بطور اقتضاء النص کے، وہ یوں کہ خلافت یا ولایت امر کی اطاعت جس بنا پر ضروری قرار دی گئی ہی، ظاہر ہے کہ وہ مسئلہ اختیار و اقتدار ہی، اختیار و اقتدار کے مختلف مدارج ہیں، اب قابل غور یہ امر ہے کہ آیا تمام مدارج اختیار محل اطاعت ہو جاتے ہیں

یا بعض مخصوص درجے، اس کا فیصلہ معمولی عقل اوّل فکر میں کر سکتی ہے، فیصلہ یہ ہے کہ صرف بعض مخصوص درجے، کیونکہ ہر درجہ کا محل اطاعت ہونا اصولِ مرکزیت کے خلاف ہے جو اسلام کے مسلّمات سے ہے، اور جو خود مسئلہ خلافت کی بھی ایک بڑی بنا ہے، پھر اندیشۂ تنازع و تصادم ہے، اب اس بحث کا فیصلہ کہ وہ مخصوص درجہ کونسا ہے، بالکل صاف ہے، یعنی سب سے بڑا درجہ، کیونکہ وہی مرکزیت و مرجعیت کی استعداد صحیح رکھتا ہے اور اس قابل ہے کہ پوری امتِ اسلامی اسکے گرد جمع ہو سکے، یہ ظاہر ہے کہ یہ درجہ سب سے بڑی حکومت کا ہے، پس عدم صراحت کے باوجود اقتضاءِ کلام کے طور پر سب سے بڑی حکومت کی قید آیۂ مذکورہ سے یقیناً مفہوم ہے، قومی تعامل بھی اسی قیاس کا مؤید ہے، آغازِ اسلام ہی سے خلافت حکومتِ اعظم رہی ہے، اور خلیفہ کل عالمِ اسلامی کا فرمانروائے اعظم ہوتا رہا اور کچھ زمانہ کو مستثنیٰ کر کے جو سخت ابتری اور بے اصولی کا زمانہ تھا یہ اصول آج تک مسلسل محفوظ چلا آیا ہے،

ترکی سلطنت کے قبضۂ خلافت کی بھی اصل بنا یہی ہے اور یہی دلیل اسکے استحقاقِ خلافت کی بھی ہے، یعنی کہ ترکی سلطنت اپنے دورِ استحکام سے ہمیشہ سب سے بڑی دولت اسلامیہ رہی ہے، جیسا کہ آج بھی ہے۔

الغرض اصولاً و تعاملاً یہ مسلّم ہے کہ خلافت، ہر اسلامی حکومت نہیں ہے بلکہ اپنے زمانہ کی سب سے بڑی حکومتِ اسلامی، پس حکومت سے خلافت کی تفسیر کرتے ہر یک وقت کئی کئی خلافتوں کا وجود لازم نہیں آتا، اس اعتراض کا ایک اور جواب بھی ہے، یہ جواب اگرچہ ایک جدید اصول کے اختراع پر مائل کرتا ہے مگر ساتھ ہی بالکل فیصلہ کن بھی ہے، جواب یہ ہے کہ جو نتیجہ اعتراضاً پیش کیا گیا ہے وہ تسلیم ہے اور اسمیں کوئی قباحت نہیں، بیک وقت کئی کئی خلافتیں اس امتیاز کے ساتھ ہوں تو کیا مضائقہ ہے کہ ایک مرکزی خلافت کلیہ ہو باقی اسکے ماتحت چھوٹی چھوٹی اسلامی حکومتوں کو بھی خلافت کے نام سے

پکارا جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس جدت کا سیاسی اثر برا ہو لیکن اصولاً کوئی قباحت نہیں لا مشاحۃ فی الاصطلاح اصل چیز تو خلافتِ کبریٰ ہے۔

(۲) خلافت بیشک حقیقت مستمرہ ہے جب تک اسلام ہے خلافت ہے اور یہ جو آیا ہے کہ تیس برس میں خلافت ختم ہو جائے گی، یہ اسکے منافی نہیں ہے کیونکہ ہمیشہ رہنے والی خلافت خلافت عامہ ہے جسکے لئے صرف حکومت شرط ہے اور خاص قیود نہیں ہیں اور تیس برس میں منقطع ہونے والی خلافت، خلافت کی ایک خاص قسم خلافت راشدہ ہے جو زمین پر اعلیٰ روحانیت و ملکیت کا ایک خاص نشان ہے، یہ بے شک تیس برس میں ختم ہو گی اور وہ ختم ہو جانے ہی کی چیز بھی، مادیت کی طرف بڑھنے والا زمانہ روحانیت کے اس اعلیٰ مظاہر کے سلسلہ کا متحمل نہ ہو سکتا تھا، لیکن خلافتِ عامّہ جو صرف مسلم حکومت اعظم سے عبارت ہے اور اس میں کوئی دوسری شرط نہیں، ہر زمانہ اسکے لئے یکساں موزوں ہے، اور اس لئے وہ موقت اور منقطع نہیں بلکہ مستمر و مسلسل شے ہے چنانچہ وہ آج تک مسلسل چلی آئی ہے، یہ جواب جس اصول پر مبنی ہے یعنی تقسیم خلافت فی الراشدہ والعامہ اس پر جمہور کا تعامل بھی سند ہے، جمہور نے تیس برس بعد عہدِ نبوی گذر جانے پر بھی منصب خلافت کو برابر قائم اور مسلم رکھا، اگر تیس برس والی حدیث میں خلافت خلافت عامہ کے معنی میں ہوتی نہ خلافت کی کوئی خاص قسم تو جمہور کس بنیاد پر تیس برس کے بعد منصب خلافت کو زندہ رکھنے کی جرأت کرتا پھر اس پر تواتراً و توالیاً تعامل قائم ہو جاتا، یہ بغیر اسکے ہو ہی نہیں سکتا کہ جمہور، خلافت کی تقسیم کا قائل تھا اور تیس برس میں ختم ہو جانے والی خلافت کو خلافت خاصّہ سمجھتا تھا، خلافتِ عامہ کے استمرار و تسلسل پر علاوہ زیر بحث حجت کے ایک اور دلیل بھی ہے، وہ حدیث من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ فمات میتۃ جاھلیۃ ہے، اس حدیث میں بیعت ہر شخص کیلئے بلا قید زمان و مکان لازم قرار دی گئی ہے، اور یہ اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ اس بیعت سے خلیفہ کی بیعت مراد ہے، پس ماحصل یہ ہوا کہ خلیفہ کی

بیعت ہر شخص کے لئے بلا قید زمان و مکان لازم ہے اور یہ مستلزم ہے خلافت کے استمرار وعدم انقطاع کو کیونکہ جس زمانہ میں خلافت منقطع ہوگی اُس زمانہ والوں کے حق میں بیعت خلافت بھی منقطع ہو جائے گی پس حکم حدیث کا عموم جاتا رہے گا جو ہر زمانہ والوں کو محیط ہے الحاصل تیس برس والی حدیث خلافت کے دوام و استمرار کو مانع نہیں ہے، اور خلافت کا حقیقت مستمرہ ہونا اپنی جگہ پر قائم ہے،

(۳) قرشیت کی شرط کی بحث نہایت پامال بحث ہے، عام طور پر اہل خبر جانتے ہیں کہ اہل تحقیق کی نگاہ میں مسئلہ قرشیت کو کوئی اہمیت نہیں ہے، بعض تو قرشیت کو سرے سے شرط ہی نہیں سمجھتے ان کے نزدیک الائمة من قریش جملہ خبریہ ہے جسمیں واقعہ کی صرف خبر مقصود ہے، واقعہ کیا ہے خلفا کا قریشی ہونا، خبر میں حصر فی القریشی کی وجہ اکثریت ہے یعنی مراد یہ ہے کہ بیشتر قریشی ہی خلیفہ ہوں گے اور یہ اقلاً غیر قریشی کے خلیفہ ہونیکے منافی نہیں ہے، بعض شرط مانتے ہیں مگر اسکے شرط ہونے کو بھی ایک شرط سے مشروط قرار دیتے ہیں، یہ اہلیت کی شرط ہے یعنی بشرط اہلیت خلافت قریشی کے مقابلہ میں غیر قریشی کو خلیفہ نہیں بنایا جا سکتا خواہ غیر قریشی بھی اہل کیوں نہ ہو لیکن چونکہ قرشیت بشرط اہلیت شرط ہے لہذا نا اہل قریشیوں کے مقابلہ میں، اہل غیر قریشی خلیفہ بنایا جا سکتا ہے، بلکہ اس کو ترجیح ہے،

اس حدیث میں اسی قسم کے اور بھی کئی احتمال ہیں، مثلاً یہ کہ قرشیت کی شرط صرف انصار کے مقابلہ میں تھی یعنی انصار و قریش کے مقابلہ کی صورت میں خلافت کا حق قریش کو ہے، مگر غیر انصار کے مقابلہ میں یہ شرط نہیں ہے، پس انصار کے علاوہ غیر قرشی، قرشی کے مقابلہ میں بھی خلیفہ بنایا جا سکتا ہے، اور یہ کہ حدیث میں خلافت راشدہ کا بیان ہے اور خبر ہے نہ کہ انشا، پس مطلب ہے کہ خلفاء راشدین قریشی ہی ہونگے، غیر قریشی نہ ہونگے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، لہذا خلافت عامہ کا اس حدیث میں کوئی ذکر ہی نہیں ہے، پس قرشیت کسی حیثیت سے اس سے متعلق نہیں ہے، نہ خبر کی حیثیت سے نہ شرط کی حیثیت سے، الغرض خلافت کی جو تعریف بیان

لکھی گئی ہے وہ الائمۃ من القریش کے مضمون کے منافی نہیں ہے، نہ اس پر کوئی اعتراض وارد ہے۔

(۴) حکومت بیشک شرط خلافت اور روحِ خلافت ہے، اور بیشک جہاں حکومت نہیں حقیقی خلافت نہیں کہیں مجازاً اور رسماً خلافت کا لفظ بولنا اور بات ہے، پس جس دور میں دولتِ عباسیہ حکومت کی صرف تصویر ہی تصویر رہ گئی تھی، اور اس سے بڑی بڑی دوسری اسلامی حکومتیں قائم تھیں، اس وقت بنظر حقیقت دولتِ عباسیہ ہرگز خلافت نہیں رہ گئی تھی، اور اس پر خلافت کا اطلاق صرف مجاز رسم پرستی تھی، جو یا تو دولتِ عباسیہ کی جلالت سابقہ کی رعایت اور توقع آئندہ کی بنا پر کی جاتی تھی یا الفت بالقدامت و مسامحت کے طور پر، اس دور میں اصلی خلافت اس دور کی سب سے بڑی حکومت اسلامی تھی پس اس کے عہد میں حقیقی خلیفہ وہ شخص نہ تھا جو لوگوں کی زبانوں پر خلیفہ تھا، حقیقی خلیفہ غازی سلطان محمود غزنوی روح اللہ روحہ تھا، جو خلافت کی بوجھ کو تمام عمر اپنے کندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھرا اور خلافت کی اصلی منشار تحفظ و اعلاء کلمۃ اللہ کو اس جلالتِ شان سے پورا کرتا گیا، کہ مسلمان ہمیشہ اس پر ناز کریں گے، اسی طرح عہد میں وہ خود حقیقی خلیفہ نہ تھا، حقیقی خلیفہ سلطان ملک شاہ سلجوقی تھا جس کی شاندار تاریخ اس عہد کی خلافت کے کارناموں کا اصلی مرقع ہے، بہرحال خلافت حکومت کے بغیر نہیں ہو سکتی، اور یہ غلط ہے کہ خلافت صرف روحانی منصب ہے اور حکومت امور زائدہ سے ہے، صحیح یہ ہے کہ خلافت ایک انتظامی منصب ہے جس کی بنا حکومت پر ہے اور روحانیت امور زائدہ سے ہے۔ جو اتفاقاً کبھی جمع ہو جاتی ہے، البتہ اتنی اہم شے ہے کہ اگر وہ حاصل ہو تو گویا جسمِ خلافت میں روح دوڑ جاتی ہے۔

(۵) انعقاد خلافت یا تقرر کے منقول طریقے دو ہیں (۱) انتخاب، (۲) ولی عہدی ان طریقوں پر اضافہ بھی ہو سکتا ہے، مثلاً استیلا و اس کے مثل، برائج الوقت طریقہ جس کی بنیاد حضرت خلیفہ اول نے ڈالی تھی، اور جو حضرت معاویہ کے عہد سے خلافت کا عام دستور العمل بن گیا، ولیعہدی ہے، پس یہ طریقہ عہد خیر القرون کی عین پیروی ہے، البتہ

ولیعہدی کا موجودہ طریقہ قدیم طریقہ ولیعہدی سے بعض فروع میں مختلف ہے، مگر چونکہ اختلاف کسی نص شرعی کا اختلاف نہیں ہے۔ علاوہ ازیں یہ اختلاف بھی ایک مصلحتِ دینی ہی پر مبنی ہے لہٰذا وہ موجودہ طریقہ کے صحیح و مطابق شرع ہونے میں مخل نہیں ہے،

(۶) خلافت و امامت اصولاً دو منصب ہیں، البتہ وہ کبھی کبھی ذاتِ واحد میں جمع ہو جاتے ہیں، جیسے خلفاءِ اربعہ اور سیدنا امام حسنؓ کی ذات گرامی میں اور آنے والے امام مہدی میں گویا خلافت و امامت، شجرۂ نبوت کی دو متقابل شاخیں ہیں، تکملۂ مضمون کے طور پر یہاں یہ امر بھی بیان کر دیا جاتا ہے کہ شریعت کی تمام ظاہری مناصب، ولایت، اجتہاد، قضاء، شیخ الاسلامی و امثالہا اصل خلافت کی شاخیں ہیں، اور شریعت کے باطنی مناصب و مقامات، مجددیت قطبیت وغیرہ سلسلۂ امامت کی کڑیاں ہیں، دونوں منصبوں کے علیحدہ علیحدہ مظاہر کی بعض مثالیں یہ ہیں، سیدنا امام حسینؓ اور آپ کی اولاد کو دیگر ائمۂ اطہار، کہ یہ امام تھے خلیفہ نہ تھے، اسی طرح خلفاءِ اربعہ، اور امام حسن اور امام مہدی کے علاوہ خلفاء کہ وہ خلیفہ تھے امام نہ تھے، خلافت و امامت میں اصولی فرق روحانیت و مادیت یا ظاہریت و باطنیت کا ہے خلافت صرف ظاہری و مادی منصب ہے بشرطیکہ جامع امامت نہ ہو جیسا کہ خلافتِ راشدہ کے علاوہ اس کے سپرد دین کے صرف ظاہری نظم و نسق ہے، اس کے برعکس امامت، صرف روحانی و باطنی منصب ہے بشرطیکہ جامع خلافت نہ ہو، اس کا حلقۂ اثر دین کا روحانی نظم و نسق ہے، خلاصہ یہ کہ یہ دونوں منصب الگ الگ ہیں، ان میں سے کوئی کسی کیلئے شرط و موقوف علیہ نہیں ہے،

(۷) خلافت کی بنا قیامِ انتظامِ شریعت ہے، جو ہر زمانہ میں ایک زندہ منتظمِ اعلیٰ کا محتاج ہے جس کا نام زبانِ شریعت میں اولی الامر و خلیفہ ہے، خلیفہ کا منصب ظاہر ہے کہ اللہ و رسول کے ماتحت ہی، اسی طرح خلافت کی اطاعت بھی مستقل شے نہیں ہے، اطاعت اللہ و اطاعت رسول ہی کا ایک شاخانہ ہی، مگر ان اصلی اطاعتوں کے متمم ہونے کے باعث بجائے خود ایک لازمی ضرورت ہے، اللہ و رسول کی اطاعتیں اگر حاصل ہوں تو تنہا کافی ہیں اور کوئی

تیسری اطاعت ایک لمحہ کیلئے سلسلۂ ضروریات میں شامل ہونے کے قابل نہیں ہے، لیکن خود ان کا حصول انفراداً نہیں تو اجتماعاً یعنی افراد کیلئے نہیں تو بحیثیت مجموعی قوم کیلئے، اور جب بحیثیت مجموعی قوم کے لئے ہے تو پھر بحکم عموم بقاعدۂ انتظام ہر ہر فرد کے لئے بھی ایک تیسری اطاعت پر موقوف ہے اور اس لئے وہ تیسری اطاعت بھی ان اطاعتوں کے ساتھ سلسلۂ ضروریات میں منسلک ہے وہ مراد خلافت کی اطاعت سے ہے

(۸) خلافت کے شرائط و فرائض مختصراً حسب ذیل ہیں (شرائط) اسلام - اقتدار تام قابلیت انتظام (فرائض) انتظام دین، انتظام ملک۔

موجودہ خلافت ان کل شرائط اور کل فرائض کی ایک خاص حد تک جامع ہے، ترکی سلطنت ظاہر ہے کہ اسلامی ہے، مسلمانوں کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ منتظم سلطنت ہے، پس تینوں شرطوں کا اجتماع ثابت، اسی طرح ظاہر ہے کہ سلطنت و دین دونوں کے انتظامات ترکی سلطنت کو بار دوش ہیں، انتظام ملک کا مسئلہ بالکل صاف ہے، اسکے بتانے کو تنبیہ و توضیح تک کی حاجت نہیں، انتظام دین کی شق البتہ کسی قدر سمجھانے کی محتاج ہے، اس کیلئے سب سے پہلے یہ بتلا دینا ہے کہ انتظام دین چار حصوں میں منقسم ہے، انتظام کلیات انتظام جزئیات، انتظام کل مقامات مہمہ، چاروں حصوں کے لحاظ سے انتظام دین کا شرف حاصل ہو تو سبحان اللہ کیا کہنا، یہ مقام کمال ہے، جس اسلامی حکومت اعظم کو وہ حاصل ہو وہ ظاہری شان کے لحاظ سے خلافت کاملہ کے درجہ کی مستحق ہے، لیکن یہ مقام کمال نفس خلافت کی شرط نہیں ہے، ورنہ اس خاص لحاظ سے بعض بعض خلافت راشدہ تک کے نام کو فہرست خلافت سے کاٹ دینا پڑیگا، جیسے خلافت عثمانی و خلافت علوی، خلافت عثمانی کے متعلق تو خیر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت ایک قائم مقام رضی خلافت قائم کر دی گئی تھی لہذا اس وقت پر انتشار کی خلافت عثمانی باب اجتہادات کیلئے سند نہیں بن سکتی، لیکن خلافت علوی کا مسئلہ تو بالکل پیچیدہ نہیں ہے، وہ جبکہ مسلم

تھی تب بھی پورا عالم اسلامی اس کے زیر نگین یا زیر انتظام نہ تھا، جب خلفائے راشدہ کا یہ حال ہے تو خلافت ہائے عامّہ کس شمار میں ہیں، پس انتظام دین چاروں اجزا کی اعتبار سے شرط خلافت نہیں ہے، البتہ دو جزا اصل و ضروری ہیں، اور انہیں کے اعتبار سے انتظام ان کا شرط خلافت ہے، وہ یہ ہیں، انتظام کلّیات، انتظام مقامات مہمّہ، ان دونوں کا اصلی و ضروری ہونا واضح ہے، کیونکہ دونوں، باقی دونوں کو بھی اصولاً محتوی ہیں، یہ بمنزلہ جڑ کے ہیں اور باقی دونوں بمنزلہ شاخوں کے، ظاہر ہے کہ انتظام کلّیات قبضہ میں ہو تو انتظام جزئیات کی راہ یقیناً کھل جاتی ہے، اسی طرح انتظامات مقامات مہمّہ صحیح ہو تو چونکہ وہ بقیہ مقامات کیلئے مرکز کا حکم رکھتے ہیں اس لئے بقیہ مقامات کے انتظام کی طرح خود بخود پڑ جاتی ہے، گویا اوّل دو انتظاموں کا مالک، ضمناً بقیہ ہے انتظاموں کا بھی والی و حامل ہے، لہذا وہ ان انتظامات کے نتائج و حقوق کا بھی بدرجۂ آخر حصّہ دار ہے، مختصر یہ کہ باب خلافت میں اصل و ضروری صرف دو انتظام دینی ہیں، انتظام کلیات، انتظام مقامات مہمّہ۔ ترکی سلطنت ان دونوں جزوں کی بہترین کفیل رہی ہے، انتظام مقامات مہمّہ کی توضیح حسب ذیل ہے۔

عالم اسلامی کے دینی مقامات مہمّہ وہ جگہیں ہیں جو مقامات مقدسہ کہلاتی ہیں مثلاً حرمین شریفین حفظہما اللہ عن الاعداء، بیت المقدس، کربلائے معلّی وغیرہ، ان کے علاوہ پورا جزیرۃ العرب، آخر میں وہ مقدس شہر جو آخری دار الخلفا ہے یعنی مقدس قسطنطنیہ اب تاریخ کی طرف رجوع کرو اور دیکھو کہ ترکی سلطنت نے جب سے عنانِ دار الخلافت ہاتھ میں لی ہے، ان مقامات مہمّہ کے دینی انتظام کا فرض کس قوت و شغف سے انجام دیا ہے اور کس طرح تمام دنیائے اسلام ایک ترکی سلطنت کی اس اطمینان بخش کفالت کی بدولت ان مقامات کی خدمت کی طرف سے آج تک سبکسارانہ و سبکدوشانہ بسر کرتی رہی ہے، اور ترکی سلطنت کو دلی دعائیں دیتی رہی ہے،

دنیا جانتی ہے کہ ترکی سلطنت نے حرمین شریفین کو کس طرح ہمیشہ سینہ سے لگائے رکھا اور دولت و جان کی قربانیاں دے دے کر اس کی حرمت کی حفاظت کی، پھر ان کو تمام محرمات و مکروہاتِ شرعیہ سے پاک رکھا یہی حال دوسرے مقامات مقدسہ کا ہے، دنیا پر روشن ہے کہ نصرانیت کی مخصوص قبلہ بیت المقدس کے اسلامی قبضہ میں غلبۂ اسلام کی جو شان پیدا ہے وہ محتاج تفسیر نہیں، اس قبضہ کو تمام مسیحی دنیا کا جوش عصبیت کے سیلاب میں قائم رکھنا وہ بھی اس طرح کہ تمام اسلامی شعائر بدستور محفوظ و موقّر رہیں ترکی سلطنت کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے کہ اگر ایک یہی تنہا فخر بھی ترکی سلطنت کے پاس ہوتا تو اس کا سینہ شعائے خلافت کے قابل تھا، خود بلد الخلفا (قسطنطنیہ) کا دینی انتظام بھی مستحقِ صد آفریں ہے، مسجد ایا صوفیہ صلیب کی جگہ ہلال کی مستقل نشان گاہ ہے قسطنطنیہ کا جمعہ، عیسائیت کی عام مرکز میں اسلامی شان و شکوہ کا ایک بے نظیر مظاہرہ ہے، وامثال ذٰلک، اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ ان مقاماتِ مہمّہ کے دینی انتظام اور اس کے نتائج سے کل عالمِ اسلامی حسب مراتب اثر پذیر ہے یہ مقامات اگر اسلام کی جگہ بد دینی یا بے اسلامی کے پنجۂ تسلّط میں ہوتے تو آج پورا عالمِ اسلامی دینی حیثیت سے زیر وزبر ہوتا، اور جس صورت میں اسلام موجود ہے وہ بھی شاید عنقا ہوتی،

انتظام کلّیات کی تشریح کیلئے اوّلاً یہ بتانا ہے کہ کلّیاتِ دین کیا ہیں تاکہ ان کے انتظامات سمجھ میں آسکیں، مگر یہ بھی لحاظ رہے کہ بابِ خلافت کے کلّیاتِ دینی ایک خاص ملک و قوم کے کلیات دینی کے بہ نسبت کہیں وسیع و بلند ہیں، کیونکہ خلافت کل عالمِ اسلامی سے بحیثیتِ مجموعی سروکار رکھتی ہے، اب مثالاً چند کلیات بتائے جاتے ہیں،

(۱) اسلامی سلطنتیں، (۲) محکمۂ شرعیہ، (۳) شیخ الاسلام رئیس محکمۂ شرعیہ (۴) مرکزیت دینی، (۵) حج، (۶) جہاد،

ترکی خلافت حسبِ استطاعت ان تمام کلیاتِ دینیہ کے انتظامات برابر کرتی رہی ہے

حتیٰ کہ آج کی حالتِ نزع میں بھی مشغول ہے، انتظامات کی دفعہ وار تشریح حسب ذیل ہے:-

(۱) اسلامی سلطنتوں کے بقاء و ترقی میں ترکی سلطنت نے ہمیشہ سعی کی ہے، کامیابی و ناکامیابی مسئلہ فرائض سے خارج ہے، یوں تو خلافِ فتہائے راشدہ میں بھی ہر سعی کامیاب نہیں ہوئی ہے، اصل چیز سعی ہے، اور ترکی سلطنت اس باب میں اسلامی دنیا کی سامنے شرمندہ نہیں ہے، اس نے مصر کیلئے برابر ہاتھ پاؤں مارے، مراکو کے لئے برابر جد و جہد کی، ایران کے لئے آمادہ بجنگ ہو گئی، افغانستان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا،

(۲) محکمۂ شرعیہ کو خاص قلمرو خلافت کے علاوہ ہر اسلامی قلمرو میں جاری کرنیکی کوشش کی، جہاں اس کا قابو چل سکتا تھا، جزائر فلیپائن تک میں اسکی جانب سے شیخ الاسلام مقرر ہو کے بھیجے گئے تاکہ وہاں محکمۂ شرعیہ قائم کریں، اگر کوئی ملک جیساکہ بدنصیب ہندوستان محکمۂ شرعیہ سے خالی رہا تو اس کی وجہ دو باتوں میں سے ایک بات تھی، یا تو اس ملک کے مسلمانوں کا جمود، یا اس ملک کی حکومت کی مزاحمت، ان میں سے کسی بات کی ذمہ دار ترکی سلطنت کا منصب خلافت نہیں ہے، خلافت کیلئے نہ تو تمام عالم کا زیرنگیں ہونا شرط لازم ہے، نہ تمام امت اسلامی کو بیدار رکھنا، خلافت ادوہ بھی خلافت عامہ غریب کس شمار و قطار میں ہے، اصل خلافت نبوت تک تو ان نقائص کی ذمہ دار ہے ہی نہیں، کہ وہ اپنے کل پیرووں کو حکومت غیر سے محفوظ یا دین و ایمان کی رو سے سراپا بیدار رکھے گی، ترکی سلطنت اس خاص صیغہ کے فرائض خلافت سے یقیناً عہدہ برا ہے، جبکہ اس نے اتنا کام کر دیا کہ خاص قلمرو خلافت میں محکمۂ شرعیہ قائم کر دیا، پھر ان تمام ملکوں میں جہاں کے مسلمان دینی حیثیت سے بیدار تھے اور اسی کے ساتھ وہاں اگر غیر مسلم حکومت ہے تو اس نے اس عمل میں کوئی مزاحمت نہ کی ہو،

(۳) یہی حال مسئلہ شیخ الاسلام کا ہے، ترکی سلطنت عہدہ شیخ الاسلامی کا مرکزی مقام ہے، ترکی کا شیخ الاسلام محکمۂ شرعیہ کے رئیس ہونے کے علاوہ سیاستہً اتنا طاقتور ہے

کہ اس کے قلم کی ایک مخالف گردش خود خلیفۃ المسلمین کو تختِ خلافت سے نیچے اُتار سکتی ہے، گویا ترکی سلطنت نے مذہب کو سیاست کا امام بنا دیا ہے، اور یہ خلافت کے شیون علمیہ میں سے ایک شان ہے، قلمرو خلافت کے باہر بھی مختلف ملکوں میں ترکی سلطنت نے اعلیٰ شیخ الاسلام کے نائب کی حیثیت سے مقامی شیخ الاسلام مقرر کئے حتیٰ کہ انگلستان میں لورپول کے مٹھی بھر نومسلموں کے لئے انگلستان کے شیخ الاسلام، مرحوم شیخ عبداللہ کوئلم تھے، اس خصوص میں ہندوستان بیشک بدنصیب ہے کہ اس میں سات کروڑ مسلمان بستے ہیں، اور ان کیلئے غلامی کے بعد سے کبھی کوئی شیخ الاسلام نہیں رہا، جیسا کہ محکمہ شرعیہ کبھی نہیں رہا، مگر جیسا کہ کہا گیا ہے ترکی سلطنت اس اندوہناک بدنصیبی کی ذمہ دار نہیں ہے، زیادہ تر ہندوستان کے غافل مسلمان خود ذمہ دار ہیں، اس کے بعد وہ غیر مسلم حکومت جس کے مضبوط جال میں ہندوستان بیکس پڑا تڑپ رہا ہے، لیکن شاید اب ہندوستان کے مسلمان بھی اپنے لئے محکمہ شرعیہ اور شیخ الاسلام قائم کر سکینگے، کیونکہ مسلمانانِ ہندوستان نے خلافت کے ساتھ عملی رشتۂ اتحاد باندھا ہے اور آہستہ آہستہ اس سمت قدم اُٹھانے شروع کئے ہیں، جو خلافت کی سمتِ مقصود ہے، ابھی ایک تحریک خلافت کے سلسلہ میں ان کو وہ تمام مذہبی لوازم پورے کرتے پڑیں گے جواب تک ان کی شامتِ اعمال سے معطل پڑے ہیں، ورنہ وہ جھوٹے اور دغاباز ٹھہریں گے، ثابت ہوگا کہ انھوں نے خلافت کو سیاست کے چہرہ کا صرف برقع بنایا تھا، مقصود اصلی سیاست تھی، خلافت سے محض آلہ کا کام لیا گیا، مسلمانانِ ہند کو متنبہ رہنا چاہئے کہ ان کیلئے مسئلہ خلافت کے بعد ایک داخلی آزمایش کا وقت بھی آرہا ہے،

(۴) مرکزیت دینی بھی ترکی سلطنت کی رہین خدمت ہے، محکمہ شرعیہ، شیخ الاسلام اور حرمین شریفین کے تاسیس و استحکام کے علاوہ براہِ راست تمام عالمِ اسلامی کو خلافت کی طرف متوجہ رکھنے کا سلسلہ ترکی سلطنت کا ایک خاص کارنامہ ہے، جو براہِ راست

خلافت کا ایک بین ترین نشان کہا جا سکتا ہے، تمام وقائع کو بالتفصیل دُہرانا تو ایک مستقل دفتر چاہتا ہے، اشارۃً چند وہ مسائل گنوا دئے جاتے ہیں جن سے وقائع مقصودہ متعلق ہیں، حجاز ریلوے، جنگ روم و یونان، جنگ طرابلس و بلقان، کلّیۂ مدینہ (مدینہ یونیورسٹی)

(۵) حج کا سارا انتظام اس اندوہناک ساعت تک یکہ و تنہا ترکی سلطنت کے سر رہا ہے جس میں سردار عرب نے اسلامی خلافت کا طوقِ عقیدت گردن سے اتار کر پھینک دیا

(۶) جہاد اور سلطنت ترکی میں تو بجنسہٖ وہی تعلق رہا ہے، جو قیس اور عشق میں سنتے آئے ہیں، تشبیہ شہرت و لزوم دونوں اعتبار سے ہے، سلطنت ترکی جہاد کیلئے جسطرح مشہور ہے، اسی طرح جہاد اس کو لازم بھی ہے، جس طرح عشق لحظہ بھر کیلئے قیس سے کبھی جدا نہ ہوا، جہاد کے ہاتھ بھی ترکی سلطنت کی گردن میں ہمیشہ حمائل رہے، اور یہی وجہ ہو کہ ترکی سلطنت کے سلسلۂ جہاد نے جو فائدے اسلام اور عالم اسلام کو پہونچائے ہیں ان کا احصا نہیں ہو سکتا، ترکی سلطنت اگر آج تک میدانِ جہاد میں تمامتر گھڑی نہ رہتی تو جزیرۃ العرب اور مقامات مقدسہ کا ماتم زدہ حشر اتنا پہلے ہو چکا ہوتا کہ شاید ہم اس کے ماتم اور مرثیہ خوانی سے بھی اب تک تھک چکے ہوتے،

مختصراً کلیاتِ دینی کے انتظامات یہ ہیں جن سے ترکی سلطنت برابر عہدہ برآ ہوتی رہی ہے، اب اصل مبحث کی طرف رجوع کرنا چاہیئے، مبحث اصلی یہ تھا کہ فرائضِ خلافت کیا ہیں، اور آیا ترکی سلطنت انہیں پورا کرتی رہی ہے یا نہیں، سلسلۂ بحث کے آخر تک یہ امر ثابت کر دیا گیا ہے کہ جو امور فرائضِ خلافت ہیں ان کو ترکی سلطنت نے مطابق وسعت یقیناً انجام دیا ہے، شرائطِ خلافت کی بحث اس سے بیشتر طے ہو چکی ہے جسکا منتہائے امر یہ ہے کہ کل شرائطِ خلافت ترکی سلطنت میں متحقق ہیں، اور یہ دونوں بحثیں اصل ہیں اس مسئلہ کی دو شقیں ہیں کہ ترکی سلطنت خلافت ہے یا نہیں، جب دونوں شقیں ترکی

سلطنت کے خلافت ہونے کی تائید میں طے ہو جائیں تو اصل مسئلہ بھی اس صورت میں متعین ہو گیا کہ ترکی سلطنت خلافت ہے،

اسی نقطہ پر ان تمام اعتراضات و سوالات سے بھی سبکدوشی ہو گئی جو مسئلہ خلافت پر دفعہ وار عائد کئے گئے تھے، پس یہاں بالکل ابتدائی اور اصلی مسئلہ (مسئلہ خلافت) تمام ذاتی مباحث کے ساتھ ختم ہوتا ہے، اس کے بعد خارجی مباحث کا حصہ آئیگا جو دو مسئلوں سے مرکب ہے، خلافت کی موجودہ حالت، خلافت کی موجودہ حالت میں عالم اسلامی کے فرائض، ذیل میں یہ حصہ شروع ہوتا ہے،

(۲)
خلافت کی حالتِ موجودہ اور عالم اسلامی کے فرائض

(۱) خلافت کی حالت موجودہ اگر پوری تفصیل اور جوش سے لکھی جائے تو بیان کا خاتمہ مشکل ہے، علاوہ اسکے یہ موضوع عام بیانات میں اتنا مبسوط و مشرح ہو چکا ہے کہ اب نئے بیانوں کی ضرورت نہیں رہ گئی، پھر یہ کہ خطبہ بہت طویل ہو چکا لہٰذا اس موضوع پر نہایت اختصار کے ساتھ صرف چند سطریں سپرد قلم کیجاتی ہیں،

خلافت کی حالتِ موجودہ تقریباً خاتمہ کی ہے، کیونکہ جدید صلحنامہ کی رو سے ترکی سلطنت (جو کہ خلافت ہے) کے اکثر بڑے بڑے حصے چھین رہے ہیں، خود مستقر خلافت (قسطنطنیہ) بھی نیم مسلوب ہے، مرکز اسلام (جزیرۃ العرب) بھی جس کا قبضہ بظاہر دلیل خلافت ہے، خلافت سے چھینا جا رہا ہے، صرف ایک یا دو صوبے محصور و مجبور حالت میں خلافت کے ہاتھ میں چھوڑ دیے جائیں گے، جن کا وجود و عدم برابر ہے، انکے حقیر جثے اور خلافت کا عظیم بار جس سے موجودہ مملکت خلافت کی بھی پیٹھ ڈہری ہوئی جاتی تھی، دونوں میں کیا تناسبت اور پھر یہ حقیر جثے بھی کب تک،

(۲) بحالتِ موجودہ عالم اسلامی کے فرائض کی داستان محتاج تفصیل ہے، اور یہ

تفصیل ضروری ہے،

فرائض کی بحث چھیڑنے سے پہلے حالتِ موجودہ کی مذہبی صورت قائم کرنی چاہیئے تاکہ اسپر فرائض مبنی کئے جائیں، حالتِ موجودہ کی مذہبی صورت کا علم ذیل کے مقدمات پر موقوف ہے،

(الف) خلافتِ اسلام کے اوّلین ارکان ثلثہ میں سے ایک رکن ہے،

(ب) اسلام کے کسی رکن کا انہدام عین اسلام کا انہدام ہے،

پس خلافت کا انہدام عینِ اسلام کا انہدام ہے، اور یہ طے شدہ ہے، کہ خلافت منہدم ہورہی ہے، تمام مقدمات کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ بحالتِ موجودہ اسلام منہدم ہورہا ہے یہی حالتِ موجودہ کی مذہبی صورت ہے، یہاں یہ ضروری امر بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ یہ انہدام بالجبر ہے نہ باتفاق محض، پس صورت مذہبی تمام وکمال یہ ہے کہ بحالتِ موجودہ اسلام، بالجبر منہدم ہورہا ہے،

اس صورتِ مذہبی کی بنا پر فرائض کی بحث حسب ذیل ہے،

اجمالی فرض تو یہاں ایک ہی ہے جو "حفاظتِ اسلام" کے ایک لفظ میں بیان ہوسکتا ہے البتہ اسکے تفصیلی مراتب اور طرقِ عمل ایک مختصر سے نظام کو چاہتے ہیں "حفاظتِ اسلام ایسی نازک حالت میں صرف انتہائی مراتب میں مطلوب ہوتی ہے، ابتدائی مراتب تو امن و سکون میں کارآمد ہوتے ہیں، منصوص انتہائی مراتب بظاہر صرف دو ہیں، ہجرت و جہاد (ہجرت کا شمار بطور مقدمہ جہاد کے ہے، اگر یہ حیثیت ہے تو وہ بھی حفاظتِ اسلام کی راہ میں سعی کا ایک مرتبہ ہے ورنہ نہیں) مگر فی الحقیقت تین ہیں، تیسرا مرتبہ عموماً کسی اصطلاح سے مصطلح نہیں کیا گیا، تاہم حقیقت منصوص ہے، اور غور کیا جائے تو اصطلاح بھی بصورت ماخذ منصوص ملے گی، اسی طرح جس طرح ہجرت و جہاد کی اصطلاحیں، مگر اس اصطلاح بلکہ حقیقت پر عام نگاہیں نہیں پڑتیں، یا اس وجہ سے کہ وہ زندگی کی عام سطح سے کچھ زیادہ نمایاں

نہیں ہیں، اس مرتبہ کی مجمل تعبیر "غیر جارحانہ زندگی مقابلہ" کے فقرے سے ہو سکتی ہے جسکا مطلب یہ ہو کہ کسی قسم کا باقاعدہ یا بے قاعدہ جنگجویانہ عمل نہ ہو، مگر جو مقصد بنا مخاصمت ہے اسکی دھن آزادانہ بلا شائبۂ مداہنت و بلا طفت جاری رہے، اور اس دھن میں فریق مخالف کے ہاتھ سے جو تکالیف پہونچیں ان کو کمال صبر و استقلال سے برداشت کا سلسلہ جاری رکھا جائے اس وقت تک کہ مقصد عزیز پورا ہو،

اس طویل عبارت کو مختصر لفظ میں ادا کیا جائے تو اسکے لئے سہل الفہم لفظ "حیات آزادی" ہے، ان الفاظ کے ماخذ ذیل کی آیات قرآنی ہیں:-

(۱) واصبر لحکم ربک۔

(۲) ولا تطع منھم اثما او کفورا۔

(۳) واصبر علی ما یقولون واھجرھم۔

حیاتِ آزادی کی حقیقت کا ماخذ بھی یہی آیات اور اس کے امثال ہیں جن میں نہ ہجرت کا حکم ہے نہ جہاد کا پھر بھی ایک خاص طریق زندگی کی طرف اشارہ ہے جو مقصد زندگی سے متعلق ہے،

قران کے علاوہ سیرت نبوی بھی اس حقیقت کا ماخذ ہے، تاسیس اسلام میں سرکار رسالت پناہ کی زندگی تین مرحلوں میں منقسم ہے، دو مرحلے ہجرت و جہاد کے تو مشہور ہیں، ایک مرحلہ دونوں سے پہلے ہے جو مکہ معظمہ میں گذرا اور یہی حیات نبوت کا مرحلۂ اول ہے، اس مرحلہ زندگی کی نوعیت پر غور کیجئے تو بآسانی نظر آئیگا کہ وہ حیاتِ آزادی کا مقدس مرحلہ تھا، ظاہر ہے کہ یہ مقدس مرحلہ کبھی کسی قسم کے جارحانہ عمل سے آشنا نہ ہوا، اسی کے ساتھ یہ ہوا کہ ذات نبوی مع اپنی مختصر سی جماعت کے اپنے مقصد مقدس آزادانہ بلا ادنی سایۂ مداہنت و متابعت مستغرق رہی اور اس کے بدلے میں فریق مخالف کے ہاتھوں جتنی تکلیفیں پہنچیں انکو کمال صبر و استقامت سے برداشت فرماتی رہی، یہی حیاۃ آزادی کی تعریف ہے انہیں سے

یہ بھی ثابت ہو سکتا ہے کہ اسلام نے حفاظت مقصد کے جو تین طریقے رکھے ہیں، حیاۃ آزادی، ہجرت، جہاد، ان کی ترتیب میں پہلا درجہ حیات آزادی کا ہے، پھر ہجرت پھر جہاد، لیکن یہ امر روشن رہنا چاہیئے کہ حیات آزادی مع ہجرت کے صرف محکومی و مجبوری کا آلہ حفاظت ہیں، حالت اختیار تو ان دو مرحلوں کی محتاج ہی نہیں ہے، اسکا تو پہلا قدم عمل، جہاد ہے، بہرحال اگر ایک محکوم قوم، جابر حکومت کے مقابلہ میں اپنے مقصد کی حفاظت چاہ رہی ہو تو اسلام سب سے پہلے اسکی رہنمائی اصولِ حیاۃِ آزادی کی طرف کریگا پھر ہجرت و جہاد کی طرف،

عقل بھی اسی نظام کی تائید کرتی ہے، اس ترقی یافتہ دور نے بھی اسی دستور العمل کی تقلید کی ہے، آج تمام محکوم قومیں جابر حکومتوں کے مقابلہ میں ترکِ وطن اور جنگ سے پہلے حیاۃ آزادی ہی کا حربہ ہاتھ میں لیتی ہیں، مصر اور آئرلینڈ اس مسلک کی تازہ نظیریں ہیں، ہندوستان نے بھی اس اصول کو پہچاننا شروع کیا ہے، مہاتما گاندھی اس اصول کے داعی ہیں، اور داعی کیا اس غریب کی تو کل زندگی ہی یہی اصول ہے، انکی قدیم ستیاگرہ اور نیا ترک تعاون حیاۃ آزادی ہی کے مختلف نام باختلاف مدارج ہیں۔

ستیاگرہ (مقاومت مجہول) حیاۃ آزادی کا پہلا درجہ ہے، ترک تعاون دوسرا درجہ جن کے لئے ماخوذ من القرآن اصطلاحیں صبر للحق اور ہجر ہیں البتہ حیاۃ آزادی کا تیسرا درجہ جس کے لئے ماخوذ من القرآن اصطلاحیں ترکِ اطاعت ہے، مہاتما گاندھی کے اسباق عمل میں ابھی کوئی سبق نہیں ہے، گویا مہاتما گاندھی درگاہِ حیاۃ آزادی کے صرف پہلے اور دوسرے درجہ کے طالب العلم ہیں، آخری درجہ ابھی تک ان کے داخلہ کا منتظر ہے،

حاصل بحث یہ ہے کہ خطرہ کے وقت، حفاظت اسلام کے صرف دو ہی طریقے نہیں ہیں جو شہرت پا گئے ہیں، ایک طریقہ اور بھی ہے اور وہ ترتیب میں مقدم ہے، یہ حیاۃ آزادی عمل کا طریقہ ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ حیاۃ آزادی اور ہجرت کے ترتیبی درجے

قوموں کیلئے ہیں، اور جہاد آزاد قوم کے لئے، اور حیاتِ آزادی و ہجرت ان میں بھی حیاۃ
آزادی پہلے ہے اور اگر یہی فتح کی کلید ثابت ہو تو پھر دوسرے مدارج تدبیر کی طرف توجہ بھی
غیر ضروری ہے، صرف ناکامی کی صورت میں بقیہ مدارج، مطمحِ التفات ہو سکتے ہیں،
اس نظام کے مطابق حفاظتِ اسلام کیلئے مسلمانانِ ہند کا موجودہ نقشۂ عمل یہ ہونا چاہیئے
پہلے حیاۃِ آزادی، پھر ہجرت، پھر جہاد، کیونکہ مسلمانانِ ہند محکوم ہیں، اور کہا جا چکا ہے
کہ اسلام میں محکوم قوموں کا پہلا آلۂ حرب حیاۃِ آزادی ہے، دوسرا درجہ ہجرت کا ہے
تیسرا جہاد کا، اور جیسا کہ کہا جا چکا ہے یہی ترتیب عقل و رواج کے بھی مسلمات سے ہے،
پس مسلمانانِ ہند کے لئے شرعاً و عقلاً پہلی منزلِ عمل یہی حیاۃ آزادی ہے، ایک
وقت خاص تک ان کو اسی منزل میں جمے رہ کر دادِ عمل دینی چاہیئے، اگر یہ منزل تسکین
بخش نہ ہو تب ہجرت کی طرف قدم اٹھانا چاہیئے، جب یہ آلہ بھی بیکار نکلے تب آخر الدواء
الکی شمشیرِ جنگ ہے، اور زورِ بازو و ہمتِ قلب کا آخری امتحان، اگر مسلمانانِ ہند بحالت
موجودہ اس نقشۂ جنگ کی پرواہ نہ کریں اور شروع کے خطِ حرب (حیاۃ آزادی) کو پھاند
کر آخری خطوطِ حربی (ہجرت و جہاد) پر قدم جمانا چاہیں تو یہ امر نظامِ مرتب کی رو سے
اصولی غلطی ہوگی، خواہ عملاً غیر متوقع حالت میں علاجِ درد ہی کیوں نہ ثابت ہو جائے
جس کے امکان سے انکار نہیں ہے،

حیاۃ آزادی کے بھی تین درجے ہیں، صبرِ للحق، ہجر، ترکِ اطاعت، جس کے
مستعمل نام بالترتیب، مقاومتِ مجہول، ترکِ تعاون، اعلانِ آزادی ہیں، ان مدارج
میں بھی اصولاً ترتیب ہے، پہلے مقاومتِ مجہول، پھر ترکِ تعاون، پھر اعلانِ آزادی،
یہ ترتیب گو شرعی نہیں ہے مگر عقلاً ضروری ہے، اور شریعت مخالف نہیں ہے، لہذا
اس کو لازم کر لینے میں مضائقہ نہیں،

اس اصول پر نقشۂ عمل میں اس دوسری ترتیب کی شرط کا بھی اضافہ کرنا چاہیئے

یعنی مسلمانانِ ہند پہلے پہل جب حیاۃ آزادی کی وادی میں اُتریں تو ان کا پہلا مرحلہ قیام مقاومت مجہول ہونا چاہیئے، نہ ترکِ تعاون یا اعلانِ آزادی، یہ عملی ترتیب بھی اصولاً اتنی ہی لازم ہے جتنی ذہنی ترتیب، اگرچہ غیر متوقع حالات میں اس سلسلہ کی بے ترتیبی بھی بعض وقت عملاً مفید ثابت ہو سکتی ہے مگر اس کی وقعت ایک باقاعدہ نظام کے مصنف یا ایک اصول پرور رہنمائے قوم کی نگاہ میں کم ہے، دونوں ترتیبوں کو ترکیب دینے کے بعد مسلمانانِ ہند کا پہلا طریق عمل حیاۃ آزادی کا پہلا زینہ ٹھہرتا ہے، یہ طریقہ ناکام رہے تب ترکِ تعاون اور وہ بھی ناکام رہے تب اعلانِ آزادی، اس مقام پر حیاۃ آزادی کی سرحد ختم ہو جائے گی، یہاں بھی ناکامی پیٹی رہے تب پاؤں کو سرحدِ ہجرۃ کی طرف اٹھنے کی اجازت ہونی چاہیئے جس کے بعد جہاد کا آخری میدان ہے،

یہ مکمل نقشۂ عمل ہے بے کم و کاست، جو اس غرض سے پیش کیا گیا ہے کہ پورے نظام کار پر نظر محیط رہے، خواہ میری گفتگو کے وقت تک نقشۂ عمل کی ابتدائی دفعات کا وقت گذر چکا ہو اور بعد کی دفعات کی باری ہو،

اب واقعات و حالات کی روشنی میں اس کا پتہ چلانا چاہیئے کہ بحالت موجودہ مسلمانانِ ہند کی عملی حالت اس نقشۂ عمل کے مطابق ہے یا نہیں، اگر ہے تو اس وقت نقشۂ عمل کے کس مرحلہ میں ہیں پھر یہ کہ بلحاظ حالات اس وقت نقشۂ عمل کی کون سی دفعہ وقت کا مسئلہ بننے کے قابل ہے، مسلمانانِ ہند کی عملی حالت سمجھنے کیلئے پہلے یہ جاننا چاہیئے کہ مسئلۂ خلافت میں انکی کارکن مجلسیں اور رہنما جمعیتیں کون کون سی ہیں، اور ان کے کارنامے اور تجاویز کیا کیا ہیں،

کارکن مجلسیں تین ہیں (۱) مسلم لیگ (۲) مجلس خلافت (۳) مجالس علماء ان کے کارناموں اور تجویزوں کی فہرست حسب ذیل ہے:۔

مسلم لیگ کچھ دنوں بار بار ایک ہی مجمل تجویز جسکی حقیقت ایک مبہم دھمکی تھی دہراتی

رہی پھر خاموش ہوگئی، اور اسی ایک فقرہ میں مسلم لیگ کے کارناموں اور منصوبوں کی پوری داستان مضمر ہے، گویا مسلم لیگ کی نہ کوئی تجویز ہی ہو نہ کوئی کارنامہ ہی،

مجلس علما دو ہیں، مرکزی اور صوبہ دار، مرکزی ابتک مُنہ سے کچھ بولی ہی نہیں بلکہ یہ کہیئے کہ صفِ اجتماع میں ابھی بیٹھی ہی نہیں، صوبہ دار مجالس علما میں سے چند میدان عمل میں کمر بستہ اتری ہیں، جہانتک مجھے یاد ہے تین مجلسیں ہیں، صوبہ متحدہ کی مجلس علمار سندھ کی مجلس، علمارِ صوبہ بہار کی مجلسِ علما، صوبہ سندھ کی مجلسِ علما کا حال مجھے پورا معلوم نہیں صرف اس قدر جانتا ہوں کہ اس نے کچھ تہدیدی واضح تجویزیں اختراع کی ہیں مگر اس کے کارنامے مطلق معلوم نہیں، بہار کی مجلس علما تجویزوں کی خدمت تو شروع سے انجام دیتی آئی ہے، اس جلسہ میں بھی اس نے اچھی اچھی تجویزیں اختراع کی ہیں کارناموں کا حال آگے کھلے گا، اب صوبہ متحدہ کی مجلس علمار رہ جاتی ہے، اس باب میں صوبہ متحدہ کی مجلس علما کو ہندوستان بھر کی مجلس علمار کہا جا سکتا ہے، مجلس علمار متحدہ نے صرف ایک ہی جلسہ کیا، جو قطعی پہلا جلسہ تھا، لیکن کیا باعتبار اثر اور کیا باعتبار تجاویز یہ جلسہ ایک جیبرِ دینی مظاہرہ تھا جس نے ساری فضاء ہند کو تھوڑی دیر کیلئے متلاطم کر دیا، اور جس نے یہ سلسلہ مسئلہ خلافت، ملک میں سیاست کی ایک بالکل جدید طرح ڈالدی، اس جلسہ کی اصلی تجویز جو جلسہ کی مدح و منقبت کا اصلی باعث ہے "اعلان آزادی" تھی مجلس متحدہ عمل کے لحاظ سے بھی پیش قدم ہے، اس نے جتنی ایجابی تجویزیں اختراع کیں ان پر عمل کی سعی بھی جاری کی، مثلاً "اعلانِ آزادی" کی تجویز کے ماتحت ایک تجویز دار القضا کی تھی جسکا یہ منشا ہے کہ ہر شہر میں ایک دار القضا قائم کیا جائے، مجلس علمار متحدہ نے جلسہ کے بعد ہی تجویز کی عملی ابتدا کی اور کانپور میں دار القضا قائم کر دیا جو اس کی بلیغ کوشش سے نشو و نما پا رہا ہے، بعد کو چند دوسرے شہروں میں بھی دار القضا قائم کرائے گئے جیسے بدایوں، لکھیم پور، آگرہ، اور خوشی کی بات ہے کہ مجلس موصوف اب تک اس کوشش میں

سرگرم عمل ہے،

مجلس خلافت اپنی وسعت اور کثرت عمل کے لحاظ سے مسئلہ خلافت کی سب سے بڑی مجلس ہے، اس نے کچھ مناسب تجویزیں بھی اختراع کیں اور اس کے تھوڑے سے ابتدائی کام بھی ہیں، اس کی مشخص تجویزیں دو ہیں، سدیشی، ترک تعاون" ایک ایجابی۔ (سدیشی) دوسری سلبی (ترک تعاون) سدیشی ابتدائی تجویز ہے، ترک تعاون بالکل تازہ تجویز ہے۔

مجلس خلافت کے جن کاموں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں،

(۱) تحریکِ خلافت کی اشاعت (۲) وفدِ خلافت کا ارسال (۳) جمع سرمایہ، تازہ کام، تحریک ترک تعاون کی دعوت وتیاری ہے،

یہ مجمل نقشہ ہے تحریک خلافت کے متعلق مجالس عمل اور ان کے عزائم و اعمال کا، ان کے علاوہ کچھ شخصی افکار و مشاغل ہیں جو بعض صنادید قوم سے متعلق ہیں، پھر بعض وہ منصوبے اور کام ہیں جو زمانہ ہیجان میں انبوہ سے خودبخود بلا تحریک خاص واقع ہونے لگتے ہیں۔

اس کے بعد قوم کی استعداد و تیاری کا تذکرہ کرنا چاہیے، جو تمام رہنمائیوں اور کار فرمائیوں کی اصل بنا ہے، اور تجاویز کی معقولیت کا ایک مستقل معیار، اس کا مجمل نقشہ ذیل کے دو فقروں میں کھینچ سکتا ہے، "جمہور ہر عمل کے لئے مستعد و تیار ہے اور طبقہ خواص کسی بات کے لئے بھی مستعد و تیار نہیں،

یہاں اپنی قوم کی تشخیص میں اگر دوسری اقوام وطن کی تشخیص بھی شریک کر دی جائے تو مسئلہ زیادہ صاف ہو جائے گا، دوسری اقوام وطن بالخصوص ہندو قوم اصولاً مسئلہ خلافت سے ہمدردی رکھتی ہے، اور اس حد تک عمل کیلئے بھی مستعد ہے جس حد تک اسکا ارتقار قومی خطرہ میں نہ پڑ جائے، یہ کیفیت ہندوستان کے خالص مسئلہ اتحاد بین الاقوامی

کا ثمرہ ہے یا اس میں انفرادی آرزوؤں کا بھی ہاتھ ہے، اسکا تفحص خارج از مقام ہے
بہرحال واقعہ یہ ہے کہ ہماری قوم ہی نہیں، مُلک کا ملک جہاں تک جمہور سے بحث ہے
مسئلہ خلافت میں مستعد و تیار ہے، اس مقام پر یہ نکتہ بھی قابل بیان ہے کہ طبقہ خواص
کا کوئی مسلک بجز ایک مسلک کے جسکا نام حبِ جاہ ہے مستقل نہیں ہوتا، اس کا ہر مسلک
طاقت کے سانچے میں ڈھلتا ہے، اور طاقت کے ساتھ ساتھ چلتا ہے، بس اگر اس وقت
قوم کے طبقہ خواص کا یہ مسلک ہے کہ جمہور کی شرکت سے بچتے رہو تو اس کی بنیاد صرف
اس قدر ہے کہ طاقت فریق مخالف میں ہے لیکن کل اگر یہ ثابت ہو جائے کہ طاقت
ادھر ہے، تو کل ہی اس کا یہ مسلک بدل جائیگا، بہرحال طبقہ خواص کا مسئلہ قومی استعداد
و تیاری میں مخل نہیں ہے طبقہ خواص کچھ ہو جب جمہور ذی استعداد ہے تو قوم مستعد
ہی کہلائے گی،

خیر یہ جملہ معترضہ تھا، اصل مسئلہ قومی استعداد کا ہے کہ وہ ہے یا نہیں، ہونا ثابت
ہے، مگر اس کی موجودہ نوعیت کیا ہے یہ بھی قابلِ بحث ہے، نوعیت یہ ہے کہ وہ
فرطِ جوش سے اُبل کر پیمانہ صبر سے چھلک چکی ہے، اور اب باہر گر گر کر چاروں طرف
آبِ نشیب کی طرح پھیلنا شروع ہو گئی ہے، یہ نتیجہ ہے کارفرمایانِ مسئلہ کی خام کاری کا،
ورنہ ضبط دشوار نہ تھا، بہرحال حالت یہ ہے، اسی بے ضبطی و بے اعتدالی کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک
طرف مجلس خلافت سدیشی و ترکِ تعاون کے نعرے لگا رہی ہے، دوسری طرف ہجرت
کا زبردست نقارہ بج رہا ہے، اور خلقت اس کی آواز پر اُمڈی ہوئی نخلستانِ افغانستان
کو دوڑی چلی جا رہی ہے، طرہ بالائے طرہ یہ کہ تحریکِ ہجرت کو قوی کرنے میں ان لوگوں کے
بھی ہاتھ شریک ہیں جو ترکِ تعاون کے بڑے بڑے واعظ ہیں،

جب حالت یہ ہے تو سوالِ مذکور کا جواب صرف بے ضبطی و بے اعتدالی کی جہت سے
نفی میں ہے یعنی قوم کی عملی حالت باوجود بہترین استعداد سے آراستہ ہونے کے مجوزہ

نقشۂ عمل کے مطابق نہیں ہے، کیونکہ ابھی حیاۃ آزادی کا مرحلہ شروع بھی نہ ہوا اور ہجرت شروع ہو گئی، درحالیکہ اس کا وقت تو مرحلہ حیاۃ آزادی کے کامل عبور کے بعد آتا، یہ امر قوم کو بے ضبطی و پراگندہ منشی کا مجرم ٹھہراتا ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند بحیثیت حصول حیاۃ آزادی کے مرحلہ میں ہیں اور درجات کے لحاظ سے حیاۃ آزادی کا دوسرا درجہ موضوع عمل ہے۔

"اعلان آزادی"

تیسرے سوال کا جواب ہندوستان کے علاوہ خود ترکی کی حالت موجودہ کے اندازہ پر موقوف ہے، کیونکہ ہندوستان تو صرف معاون ہے، معاونت میں اس کے حالات و امکانات کا لحاظ بھی ضروری ہے، تاہم بیمار کی تیمارداری میں جتنا ضروری تیمارداروں کا لحاظ ہے، اس سے کہیں زیادہ بیمار کا لحاظ ہے، بیمار اگر ہلاکت کے قریب ہے تو تیمارداری کی محنت و قربانی بڑھ جانی چاہئے، خواہ تیمارداروں کا بوجھ سخت بھی ہو جائے، ورنہ تیمارداری خود تیمارداروں کی نگاہ میں کچھ ہو، بیمار کے حق میں فضول غوغا سے زیادہ نہیں، اسی طرح ہماری اعانت و غمخواری کی قربانی کو ترکی کی ضرورت کے مطابق ہونا چاہئے، ورنہ ہماری اعانت کا ہدیہ خواہ ہم اس کی کوئی قیمت لگاتے ہوں ترکی کیلئے بیکار ہوگا،

ترکی کی موجودہ حالت کا نقشہ مختصر عبارت میں یہ ہے کہ وہ یورپ کے پنجہ میں ایک عاجز شکار ہے اور یورپ اس شکار کو پھاڑنے کے لئے دانت کھول چکا ہے، اور اس جوش حرص میں تمام پند و نصائح بیکار ہو چکے ہیں، ترکی اس خونخوار پنجہ سے چھوٹنے کی مذبوحانہ کوشش کر رہا ہے، لیکن تنہا چونکہ عاجز ہے اس لئے زندگی کے لئے اسکی سراسیمہ نگاہیں اپنے غمخواروں پر جمی ہوئی ہیں،

ترکی کی یہ حالت جس مدد کی محتاج ہے اس کا پیمانہ اس مدد سے ہرگز کم نہ ہونا چاہئے جو ایک عاجز شکار کو خونخوار درندے سے بچانے میں درکار ہے۔ اگر ترکی کی مدد اس پیمانہ سے

کم کی گئی، یہ ایسی ہی مدد ہوگی جیسی شکار کے پھاڑ ڈالے جانے کے بعد شکار کو پہنچ سکتی ہے
گویا ع بجنازہ گر نہ آئی بمزار خواہی آمد۔

ترکی کی مدد کا پیمانہ کیا ہے، ترکی کی حالت اور ہندوستان کی انتہائی استعداد کے مجموعی اندازہ کے بعد یہ پیمانہ، حیاتِ آزادی کا آخری درجہ یعنی ترکِ اطاعت یا "اعلان آزادی" ہے، نہ کہ اس کا درمیانی درجہ ہجرت یا ترکِ تعاون جس کے داعیِ اعظم مہاتما گاندھی ہیں یہ درجہ تو اپنا صحیح وقت گذار چکا، اس کا اصلی وقت تو خالی دھمکیوں میں گذر جانے دیا گیا، جس دن ترکی کے خلاف پہلا اعلان ہوا تھا وہ دن ترکِ تعاون کے آغاز کا دن تھا، اور وہ سخت دن ترکِ تعاون کے بند ہو جانے کا دن تھا جس دن ترکی کی دستاویز صلح پر تصدیق کی مہر لگا دی گئی، اور وہ دن اعلانِ آزادی کے آغاز کا دن تھا، اور اس کے بعد سے آج تک کا وقفہ مدت، اعلانِ آزادی کی عملی سرگرمیوں کا حصہ تھا اور اس کے بعد اس کا وقت آخر اس منحوس ساعت تک تھا جس میں اصلی مخاصمین کی طرف سے جنگ کا باقاعدہ اعلان ہو جاتا وہ دن ہجرت کے آغاز کا تھا اور ہجرت و جہاد میں تو اصولاً کوئی وقفہ نہیں ہے، ہجرت جہاد کا بلا واسطہ مقدمہ ہے، البتہ اتفاقاً صرف اتنا وقفہ ہو سکتا ہے جو عملِ مقصود اور اس کی تیاری میں ہوتا ہے، واضح رہے کہ "اعلانِ آزادی" کو بھی وقت کا حربہ ٹھہرانا اصلی فیصلہ نہیں ہے اس میں بھی معذوری کا رنگ شریک ہے، کیونکہ ہندوستان کی موجودہ استعداد کا مسئلہ اصلی فیصلہ کی راہ میں حائل ہے، اصلی فیصلہ تو اسی وقت بلا تاخیر اعلانِ جنگ کا ہے تاکہ ترکی کے مخاصمین خود طبلِ جنگ پر چوب لگانے سے پہلے ہندوستان کی یہ ہولناک آواز سن لیں اور مسئلہ ترکی کا قبل از وقت اندازہ کرنے کے قابل ہو جائیں لیکن آہ غلام ہندوستان اور مجبور ہندوستان میں یہ سکت کہاں، ہاں کچھ دن پہلے تھی اور شاید کچھ دن بعد آ جائے،

بہر حال بدرجۂ معذوری، وقت کا مسئلہ کم از کم اعلانِ آزادی ہے جو ترکی کی غالباً نصف اعانت بمقابلہ مطلوبہ اعانت کر سکتا ہے،

اس مسئلہ کی خطرناکی بے شبہ ہے، بے شبہ خود ہندوستان کو اس سے بظاہر بڑا نقصان پہونچے گا، لیکن بغیر اس کے کیا ترکی کی مدد ممکن بھی ہے، ؟ ہرگز نہیں، یہ مغالطہ نہو کہ زبانی شور وغل ترکی کی مدد ہے، یہ مدد تو نہیں، البتہ مدد کا اظہار ہے یا مدد کا تہیہ، اور مسئلہ ترکی پر کیا منحصر ہے کسی بین الاقوامی جنگی معاملہ میں کسی کی مدد بغیر نقصان کے ممکن ہے، ؟ ہرگز نہیں، بس ہندوستان کیلئے مسئلہ ترکی میں صرف دو ہی راستے ہیں، برداشت نقصان کے ساتھ ترکی کی مدد یا ترک مدد، ان دونوں کے درمیان اگر کوئی تیسری راہ ہو تو وہ نفس کے دھوکہ کی ہے، یا بصیرت کی کمی کی،

جو لوگ آج یہ بین بین راہ اختیار کر رہے ہیں کہ زبان سے ترکی کی مدد کا بھی دعویٰ ہے اور ترکِ تعاون اور اس کے مثل تدبیروں سے انہیں خطرناک بتا بتا کر ہندوستان کو باز بھی رکھنا چاہتے ہیں ان کی عقل و دیانت دونوں مشتبہ ہیں، عجیب بات یہ ہے کہ وہ ترکی کی مدد کو روکتے بھی ہیں اور اپنے تئیں مددگار بھی جتلاتے ہیں،

مہاتما گاندھی اور ان کے رفقا ان الزاموں کے تو ملزم نہیں ہیں کیونکہ ان کا نظامِ عمل ترکی کی مدد ہی ہے، لیکن چونکہ وہ غیر موثر مدد ہے اسلئے ان کو بھی کامل حق اعتماد نہیں ہے، کچھ نہ کچھ غلطی یا کمزوری کی نسبت ان کی طرف ناگزیر ہے، مگر اس کے ساتھ ہی یہ ضرور ہے کہ اس کمزور عمل میں بھی جتنی حریت و اہلیت اور اس کے ساتھ ہی جتنی بڑی شخصیت درکار ہے اسکے اشخاص ابھی میدان میں نظر نہیں آتے، اس لئے عملاً لامحالہ اسی جماعت کو معتمد علیہ اور ترکِ تعاون ہی کی تحریک کو وقت کا مسئلہ ماننا پڑیگا، خواہ وہ قطعاً بعد از وقت ہو مگر یہ کہ ع مردے از غیب بروں آید و کارے بکند۔

البتہ ترکِ تعاون خود ہندوستان کے لئے بلا تردد، وقت کا مسئلہ ہے اور اگر اس تحریک کی مستتر غرض یہی ہو تو کوئی شک نہیں کہ اس کے محرکین ہر حیثیت سے کامل اعتماد کے لائق ہیں، اور اس حیثیت سے ہر ہندوستانی کو خواہ وہ دلدادۂ خلافت ہو خواہ نہ ہو

اس جماعت کی پیروی لازم ہے، اور اس لحاظ سے کہ یہ زینہ ہے اعلان آزادی کا گو ناجائز تاخیر کے ساتھ سامنے لایا گیا ہے، فدائیان خلافت کو بھی ہمہ تن شغف تمام شریک ہو جانا چاہیئے مگر ہر وقت اس امر کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ اصلی ذریعہ مراد اعلان آزادی ہے

"قابل ذکر طریق عمل"

خطبہ میں طریق عمل کے تمام جزئیات بتا دینا خلاف دستور ہے، اس لیے کلیات پر اختصار کیا جاتا ہے، طریق عمل کے شعبہ کلیات کو دو حصوں میں منقسم کرتا ہوں تمہیدیات و عملیات، ان دو حصوں میں بھی تمہیدیات پر زیادہ بحث کرونگا، کہ پہلی منزل یہی ہے،

(تمہیدیات) اس حصہ میں اشاعت خلافت کے علاوہ دو چیزیں راس التجاویز و اہم المہمات ہیں،

(۱) نصب شیخ الاسلام ہند مع محکمہ شرعیہ، (۲) ہندوستان کے مشترکہ سیاسی نصب العین کو اصلی مقصود کی طرف بلند کرنا، دونوں تجویزیں ایک خاص نظام عمل کو چاہتی ہیں، ان میں سے پہلی تجویز کا نظام عمل علیحدہ تیار اور چھپا ہوا ہے، جو بوقت ضرورت شائع کر دیا جائے گا، دوسری تجویز کا نظام عمل جلد بن جانا چاہیئے، پہلی تجویز کی تکمیل زیادہ تر علما کا فرض ہے، علما کو چاہیئے کہ مردانہ وہوشمندانہ وار اس فرض کیلئے میدان عمل میں اتریں، اور تا حصول مدعا جد و جہد کو برابر ہر حال میں جاری رکھیں، علما کے پاس اس فرض کو انجام دینے کے لئے بہترین آلہ انجمنہائے علما ہیں، علما کو چاہیئے کہ جلد سے جلد اس مقصد کو انجمنہائے علما کا واحد موضوع قرار دیدیں اور ان کی آئینی قوت سے اسکی تکمیل کا کام لیں، حضرات علما کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر یہ مقصد انجمنہائے علما کا موضوع قرار نہ دیدیا گیا تو انجمنہائے علما کی عمر بہت تھوڑی رہ جائے گی، اور جب تک رہیں گی دوسری مجلسوں کے ہاتھ میں آلہ رہیں گی،

دوسری تجویز کے متعلق ایک اصولی مشورہ یہ ہے کہ تمام خدام خلافت کو جلد سے

جلد مسلم لیگ، کانگریس، اور ہوم رول لیگ میں انڈل پڑنا چاہیئے، اور ان مجالس کی
کثرت آراء کو اپنے قبضہ میں کر لینا چاہیئے، اگر یہ طریقہ بسرعت تمام کامیاب نظر آئے
تو ان مجالس کی شرکت کو باقی رکھتے ہوئے ایک علیحدہ مجلس سیاسی قائم کرنی چاہیئے
جس کا نصب العین ہندوستان کی حریت مطلقہ ہو،
یہ تجویز زیادہ تر سیاسی جماعت سے متعلق ہے، لیکن طبقہ علما کو بھی اس سے علیحدہ
نہ رہنا چاہیئے بلکہ اس تحریک کا سرگرم رکن ہونا چاہیئے،

"استدعا"

حضرات علماء موجودہ وقت میں آپ پر جو فرائض ہیں مع ان کے اصلی طریق عمل کے
آپ کے پیش نظر کر دیئے گئے ہیں، اب آپ کیلئے صرف ایک ہی کام ہے، فرائض
کی تکمیل، آپ کو اس کام میں ذرہ برابر جھجکنا نہ چاہیئے، نہ آپ کی جانب سے اس کا
اندیشہ ہے، آپ کی شان اس سے بالاتر ہے، کہ آپ کے متعلق اس قسم کے وساوس
دماغوں میں آئیں، آپ کی شان میں انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء آیا ہے
آپ اگر وہی علماء ہیں جن کی الٰہی مدح میں یہ آیت وارد ہے تو یہ امید بالکل بجا ہے
جو آپ سے باندھی گئی ہے، بے شک آپ کے قلوب خشیۃ الٰہی کے سوا کسی دوسری
خشیۃ کیلئے مقفل نہیں سکتے، یہ بھی ہے کہ آپ وارثان نبوت اور سرداران امت
ہیں، اس منصب کا احترام بھی آپ کو کرنا پڑے گا، اس منصب کا احترام آپ سے
انتہائی جرأت و ایثار کا تقاضا کرتا ہے، بس اس جہت سے بھی آپ کو مردانہ وار میدان
میں آنا ناگزیر ہے، یہ بھی صاف صاف کہہ دینا چاہیئے کہ اگر فرائض سیادت کے پورا
کرنے سے آپ قاصر رہے تو سیادت کا تاج دیر تک آپ کے سر پر نہیں رہ سکتا، بہت جلد
زمانہ کا بیدرد ہاتھ جو مشیت ایزدی کے اشارہ سے ہمیشہ عزت و ذلت کے انقلابات
برپا کرتا رہتا ہے آپ کا تاج سیادت چھین لیگا، اور آپ کو گمنامی اور ذلت کے اس گوشہ

میں ڈالدے گا، جہاں اکثر مذاہب کے علما پڑے دم توڑ رہے ہیں پھر یہ کہ آپ خود جو احکامِ الٰہی کی مخلصانہ پابندی اور اللہ کی راہ میں جان و مال قربان کرنے کے وعظ و برابر کہتے رہے ہیں اور لوگوں کو اس کی دعوت دیتے پھرے ہیں، کیا آج جب اس وعظ و دعوت پر عمل کا خاص وقت آگیا ہے تو آپ خود ان باتوں کو بھلا دیں گے، کیا آپ دیدہ و دانستہ اتامرون بالبر و تنسون انفسکم کے وعید آمیز طعن کا اپنے کو نشانہ بنائیں گے، نہیں مقدس علما، ایسا نہیں ہونا چاہیئے، ہرگز ہرگز ایسا نہیں ہونا چاہیئے، اور واللہ ایسا نہ ہوگا اور ہرگز ہرگز ایسا نہ ہوگا، اگر خدا کی رحمت شریک ہے اور قوم کو اسلام سے جدا ہونا نہیں ہے تو آپ یقیناً ابھی آنکھیں کھولیں گے، فرض کو پہچانیں گے، اور اس کو ہر قربانی کے ساتھ ادا کریں گے، پھر انشاء اللہ آپ فتحیاب ہوں گے، اللہ کی توفیق و نصرت آپ کے شریک حال ہو، اور اسلام کو اس نازک مرحلہ میں کامیابی نصیب ہو، آمین حسبنا اللہ ونعم الوکیل +

شکریہ اور خاتمہ

آخر میں اے حاضرینِ جلسہ اور اے حضراتِ علما، تمام میزبانوں کا اور جملہ رضاکاروں کا مخلصانہ شکریہ ادا کرتا ہوا محبت سے سرشار اور امیدوں سے لبریز آپ سب سے رخصت ہوتا ہوں،

آپ جہاں ہوں خدا آپ کے ساتھ ہو +

(فقیر آزاد سبحانی)